ڈاکٹر نذیر فتح پوری

پونے کے ادبی افق کا سورج

ڈاکٹر نسرین رمضان سیّد

ڈاکٹر نذیر فتح پوری

(پونے کے ادبی اُفق کا سورج)

مرتبہ

ڈاکٹر نسرین رمضان سید

Dr. Nazir Fatepuri
Pune Ke adbi Ufaqe Ka Suraj
by
Dr. Nasreen Ramzan Sayyed

نام کتاب	:	ڈاکٹر نذیر فتح پوری
		(پونے کے ادبی اُفق کا سورج)
مرتبہ	:	ڈاکٹر نسرین رمضان سید
سالِ اشاعت	:	2016ء
تعداد	:	پانچ سو
صفحات	:	136
کمپیوٹر کمپوزنگ	:	شاہد اختر، حرا کمپیوٹرس، مالیگاؤں
طباعت	:	نورانی آفسیٹ پریس، مالیگاؤں
قیمت	:	100/-

انتساب

ڈاکٹر نذیر فتح پوری کے نام

جنھوں نے

میرے ادبی سفر میں

میری ہمت افزائی کی

ڈاکٹر نسرین رمضان سید (پونے مہاراشٹر)

فہرست

تعارف

نام : ڈاکٹر نسرین رمضان سید

تعلیم : ایم اے۔ پی ایچ ڈی

پیشہ : معلمی

تصانیف : ☆ایک کہانی ایک نصیحت ۲۰۰۹ء (بچوں کے لیے کہانیاں)

☆زندگی ایک افسانہ ۲۰۱۰ء

(افسانوں کا مجموعہ، مہاراشٹر راجیہ اُردو ساہتیہ اکادمی، سے انعام یافتہ)

☆چراغ کا جن اور زید ۲۰۱۱ء (بچوں کے لیے کہانیاں)

☆بھیگی پلکیں مسکراتے ہونٹ ۲۰۱۱ء (افسانوں کا مجموعہ، بہار اُردو اکادمی سے انعام یافتہ)

☆خواہشوں کے بھنور ۲۰۱۳ء (افسانوں کا مجموعہ)

(۲۰۱۳ء کے لیے اُتر پردیش اُردو اکیڈمی سے انعام یافتہ)

☆تحفہ ۲۰۱۴ء (بچوں کے لیے کہانیاں)

☆لکیر کا فقیر ۲۰۱۴ء (بچوں کے لیے کہانیاں) این سی پی یو ایل کی جانب سے شائع

☆دِل کی گلی میں چاند اُترا ۲۰۱۴ء (ناول)

☆شاعرہ۔ساوتری بائی پھلے ۲۰۱۵ء

☆مہاتما جیوتی راؤ پھلے (نظریات اور ان کا ادب) ۲۰۱۵ء

زیرِ اشاعت : ☆خواتین ناول نگار ☆دھنک سے خواب (ناول) ☆ڈراموں کا مجموعہ

☆سُلطانہ چاند بی بی ☆ڈاکٹر راجندر پرساد ☆شہید ٹیپو سُلطان

☆سوامی وویکانند (بچوں کے لیے) ☆افسانوں کا مجموعہ (ہندی میں)

خط و کتابت کا پتہ:

ڈاکٹر نسرین رمضان سید ۹۹۲۱۴۸۱۲۴۱

زید کاسل، سنکیت پارک، محمد واڑی روڈ

محمد واڑی، ہڈپسر، پونے، مہاراشٹر 60

Email : nasreensayyed1967@gmail.com

پیش لفظ

پونے میں اردو زبان اور اُردو ادب کی ابتداء کب سے ہوئی یہ کہنا مشکل ہے۔ 1820ء میں پونے میں مراٹھی کے ساتھ ساتھ فارسی پڑھائی جاتی تھی۔ جہاں تک اردو کا تعلق ہے پونے فارسی جاننے والے سیتارام گوڈبولے پہلی عالمی جنگ کے دوران ترکستان گئے تھے۔ انھوں نے ''اردو ہندوستانی زبان'' کی ڈگری حاصل کی تھی۔ وہ انگریزوں کو اردو پڑھایا کرتے تھے۔ پونے کے ہی نارائن اپا جی گوڈبولے نے ''بہارِ دانش'' کی فارسی حکایتوں کا اردو ترجمہ 1860ء میں کیا تھا۔ تب سے زمانہ حال تک اردو زبان میں کئی کتابیں لکھی گئیں اور ان شاء اللہ لکھی جاتی رہیں گی۔ پونے میں جب فلمی صنعت اپنے عروج پر تھی اس وقت کئی مایۂ ناز شعراء اور ادباء نے پونے میں قیام کیا اور اپنی قلم کے جادو سے اردو کو مالا مال کیا۔ ان شعراء اور ادباء میں جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی، منٹو، کرشن چندر، میراجی، اختر الایمان، جاں نثار اختر، حمید بھٹ، برج بھوشن، وغیرہ شامل ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب ''غبارِ خاطر'' میں کئی حوالوں سے پونے کا ذکر ملتا ہے۔ دیکھا جائے تو پونے میں اردو نثر نگاروں کی تعداد زیادہ نہیں رہی البتہ شاعری کا بول بالا رہا۔ نثر نگاری کی ابتداء پونے میں کب ہوئی یہ تحقیق کا موقعہ ہے۔ ہاں لیکن اب تک اب تک کی تحقیق کے مطابق یہ بات سامنے آتی ہے کہ خورشید نکہت صاحبہ نے جنوری 1964ء میں اپنا ناول ''بجھے چراغ جل اٹھے'' لکھا تھا جسے چمن بک ڈپو، دہلی 6 نے شائع کیا تھا۔ 1968ء تک ان کے چھ ناول شائع ہو چکے تھے۔ اور

انہوں نے 4 انگریزی ناولوں کا اردو ترجمہ کیا تھا۔

یہ تو ہوئی ناول کی بات، 1923ء میں حجازی میرٹھی کی ادارت میں پونے سے رسالہ ''گلزارِ سخن'' شائع ہوا تھا۔ اس رسالے میں ایک جاپانی کہانی کا ترجمہ نثر میں شائع ہوا۔ کہانی کا نام تھا'' پیالہ پوش شہزادہ کا قصہ'' اس کے بعد یہ سلسلہ جاری رہا۔ مئی 1952ء میں ماہنامہ ''شاہین'' کا پہلا شمارہ پونے کی جان محمد اسٹریٹ سے شائع ہوا۔ اس شمارے میں 4 افسانے شائع ہوئے۔ جس میں جمیل مالک کا افسانہ ''زمرد'' شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد رسالوں کا سلسلہ چل نکلا۔ جس میں ایک اہم نام اسباق کا ہے جو 1981ء سے تاحال اپنی ادبی خدمات سے اردو کو سرفراز کر رہا ہے۔

پونے کے نثر نگاروں میں یہاں مقیم اور چند روز قیام کر اپنی نثری تحریر کو منظرِ عام پر لانے والے مصنفین میں صادق درانی حیدر آبادی، پریم شرر، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر عصمت جاوید، خورشید نکہت، ایم ایف پرویز، نذیر فتح پوری، رشید اعجاز، مشتاق مدنی، قاضی مشتاق احمد، محمد خالد انصاری، زین العابدین، ڈاکٹر نسرین رمضان سید، ڈاکٹر طاہرہ عبدالشکور اور تا کیدار شمشاد جلیل شاد شامل ہیں۔

نذیر فتح پوری کی پیدائش راجستھان کے فتح پور کی ہے۔ لیکن پونے ان کی کرم بھومی ہے۔ اپنے ادبی سفر کی ابتداء انہوں نے اسی شہر سے کی۔ ان کا ادبی سفر کہانیوں، افسانوں، ناولوں، شاعری، سے ہوتا ہوا تحقیق تک جا پہنچا ہے۔ نذیر فتح پوری کی اب تک 70 کے قریب کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ 36 کے قریب ان کے غیر مطبوعہ مسودے ہیں۔ یہ پونے کے ادبی سرمائے میں اہم افسانہ ہے۔ 20 سے ائدان کے فکر وفن پر کتابیں اور گوشے شائع ہو چکے ہیں۔ Ph.d. کی ڈگری کے لیے ان کی کتب اور ان کی شخصیت اور فن کو موضوع بنا کر ریسرچ اسکالر اپنی ریسرچ کر رہے ہیں۔ نذیر فتح پوری شاعر ہیں، ناول نگار، افسانہ نگار، افسانچہ نگار، تنقید نگار، اور کہانی نویس بھی ہیں۔

اور تمام اصناف کو انصاف دینے میں کامیاب بھی رہے ہیں۔ تاریخ و تذکرہ عمدہ طریقے سے تحریر کرنے والے نذیر فتح پوری اپنی ذات تک محدود نہیں ہیں بلکہ وہ ادب کے میدان میں قدم رکھنے والوں کی ہمت افزائی نہایت خوش اسلوبی اور ایمانداری سے کرتے ہیں۔ ان کے کلام اور نثر کو سراہتے ہیں اور اصلاح بھی کرتے ہیں۔ ان کی یہ خوبی ان کی ادب کی خدمت کو اور بھی نکھارتی ہے اور انہیں اوروں سے منفرد اور اہم بھی بناتی ہے۔ میرے ادبی سفر کے ابتداء میں ان کی ہمت افزائی اور اصلاح نے بہت ہی اہم کردار نبھایا ہے۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ ان کی نثر نگاری کو لے کر لکھے گئے مضامین کو مرتب کر رہی ہوں۔

ان کی نثری خدمات کو دیکھتے ہوئے ان کو پونے کے ادبی اُفق کا سورج کہنا غلط نا ہوگا۔

ڈاکٹر نسرین رمضان سیّد

شکریہ

'نذیر فتح پوری' ایک ایسا نام جو کسی تعریف کا محتاج نہیں۔ اردو ادب میں ناول، شاعری، نثر نگاری، افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ تاریخ و تذکرہ اور ترتیب و انتخاب کے زمرہ میں آنے والی کم و بیش 60 سے زائد تصانیف شائع کرنے والے پونے کی ادبی سرزمین کے سورج ہیں۔ ان کے غیر مطبوعہ مسودوں کی تعداد 33 سے زائد ہے۔ اسی طرح ان کے ادب پر لکھنے والوں کی تعداد بھی خاصی ہے۔ اُن کے فکر و فن پر 16 سے زیادہ کتب مرتب ہو چکی ہیں اور گوشے شائع ہو چکے ہیں۔ میرے ادبی سفر کی ابتداء میں اہم کردار نذیر صاحب نے نبھایا ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں آج اس قابل ہوں کہ اس عظیم ناول نگار، افسانہ نگار اور شاعر کے لیے ایک کتاب مرتب کر رہی ہوں۔ میرے لیے یہ خوشی اور فخر کی بات ہے کہ میں چنندہ تبصرہ نگاروں کے تبصروں کا مجموعہ مرتب کر رہی ہوں۔

اس کتاب میں نظام ہاتف، مراق مرزا، م ترنم، ڈاکٹر مجیب احمد آزاد، دلدار ہاشمی، انیس چشتی، ڈاکٹر پریمی رومانی، ڈاکٹر محبوب راہی، نور الحسنین، کلدیپ گوہر، ڈاکٹر ستیہ پال آنند، رفیق شاہین، محب الرحمٰن وفا، ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی کے مضامین شامل ہیں۔ ان تمام حضرات اور خواتین کا میں تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں کہ انھوں نے اپنے مضامین اس کتاب کے لیے فراہم کیے۔

ڈاکٹر نسرین رمضان سیّد

نذیر فتح پوری کی ناول نگاری

نظام ہاتف، مراد آباد

اردو ناول کی عمر بہت کم ہے۔ یہی سو سال کے قریب، اور اگر بالکل ابتدا سے لیں منشی کریم الدین اور ڈپٹی نذیر احمد کے ٹائم سے تو عمر کو تھوڑا بہت کھینچ کھانچ کر بڑھایا جا سکتا ہے، مگر وہ دور وہ ہے جب ہم نفسِ ''ناول'' کو جانے بغیر ''ناول سا کچھ'' لکھتے تھے اس کے بعد سلسلہ لکھنے کا چلا تو چل نکلا، مگر زیادہ بے تحاشہ اور اناپ شناپ ناول پچھلے بیس پچیس سالوں میں ہی لکھے گئے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ناولوں کا ایک ہجوم نظر آنے لگا۔ دور تک اُگی ہوئی MUSHROOM CROP یعنی ککرمتوں کی کاشت کے طرح!

قرۃ العین حیدر نے اللہ اللہ پڑھ کر ناولوں کا ڈھیر لگا دیا۔ ''آگ کا دریا''...... ''چائے کا باغ''، ''دلرُبا'' اور ''اگلے جنم مجھے بیٹیا نہ کیجو'' وغیرہ ان کے خوش نام/ بدنام ، ناول ہیں۔ محمد احسن فاروق نے ''شام اودھ'' اور ''سنگم'' لکھ مارے، قاضی عبدالستار نے ''شب گزیدہ'' اور ''دارا شکوہ'' عبداللہ حسین نے ''اداس نسلیں'' ''باگھر'' ''ندی'' اور ''رات'' (ناولٹ) شوکت صدیقی نے ''خدا کی بستی'' نثار بٹ نے ''نئے چراغ نئے گلے'' اور ''نگری نگری'' پھر ''مسافر'' لکھے۔ اقبال متین نے ''چراغِ تہِ داماں'' ''نچا ہوا البم'' ''خالی پٹاری کا مداری'' خواجہ احمد عباس نے ''انقلاب'' اور ''نکسلائیٹ''۔ خدیجہ مستور نے ''آنگن''۔ جیلانی بانو نے ''ایوانِ غزل''، حیات اللہ انصاری نے ''لہو کے پھول'' (پانچ جلدوں پر مشتمل) وغیرہ لکھا

اس پر بھی کافی لے دے ہوئی (عتیق الرحمٰن قاسمی نے لکھا کہ ناول اور سیاسی کتاب کا فرق انصاری صاحب سے پوچھنا پڑے گا) عصمت چغتائی نے ''ٹیڑھی لکیر'' میں وہ کوڑیاں اٹھائیں جو اٹھا تو اور لوگ بھی سکتے تھے مگر انشاء کے ریمارک سے شائد خائف تھے جنہوں نے سحر البیان کے حوالے سے میر حسن کو لکھ دیا کہ مثنوی کیا لکھی ہے سانڈے کا تیل بیچتے ہیں'' کاغذی ہے پیرہن'' ''موصومہ'' ''عجیب آدمی'' ''دل کی دنیا'' اور ''ایک قطرہ خوں'' نے الگ ہنگامہ مچایا۔ انتظار حسین کی ''بستی'' حجاب امتیاز علی کا '' پاگل خانہ'' انور سجاد کا ''خوشیوں کا باغ'' رضیہ فصیح احمد کا '' آبلہ پا'' خوب چلے مستفر حسین نے ''فاختہ'' لکھا تو جمیلہ ہاشمی نے '' آتشِ رفتہ'' ''تلاشِ بہاراں'' ''چہرہ بہ چہرہ روبرو'' الطاف فاطمہ نے ''دستک'' آمنہ ابوالحسن نے ''واپسی'' اور ڈاکٹر صغریٰ مہدی نے ''پروائی'' (ناولٹ) رضیہ بٹ نے ''رملہ'' ''شائنہ'' ''نورین'' ''ناجیہ'' اور ''بینی'' لکھے۔ حمیدہ جبیں نے ''دل کا شہر'' اور '' آبرو'' عفت موہانی نے تکیم اور ''ایک چراغ دور کا'' خالدہ محمود نے ''بنجارن'' ''غزل'' اور ''دل کا کیا رنگ کروں'' لکھے اسی طرح عزیز احمد نے ''ایسی بلندی ایسی پستی'' راجندر سنگھ بیدی نے ''ایک چادر میلی سی'' (ناولٹ)۔ کشمیری لال ذاکر نے ''دھرتی سدا سہاگن'' ''کھجوراہو کی ایک رات'' اور ''کرماں والی'' لکھ کر بتایا کہ میں بھی ہوں۔ فضل احمد کریم فیضی نے ''خونِ جگر ہونے تک'' ممتاز مفتی نے ''علی پور کا ایلی'' فاروق خالد نے '' سیاہ آئینے'' سلمیٰ کنول نے ''بہارو پھول برساؤ'' اور ''سہاگن'' دیبا خانم نے ''انارکلی'' '' آخری وعدہ'' ''رتجگا'' '' آنکھ مچولی'' لکھے تو علیم سرور نے ''بہت دیر کر دی'' بشریٰ رحمٰن نے ''پیاسی'' ''چارہ گر'' اور سلمیٰ یاسمین نے ''بوئے گل'' لکھا۔ بشیشر پردیپ نے ''پہلی بار'' لکھا تو جاوید کاظمی نے ''بجھتے چراغ امڈتے آنسو'' احمد ابراہیم

علوی نے ''بوجھل بوجھل پلکیں'' گہر لدھیانوی نے ''بائیس دن'' اور ''حماقت'' کنہیا لال کپور نے ''بال و پر'' لکھا ارشاد امروہوی نے ''شمیم منزل'' فاطمہ انیس نے ''زخم اور ناخن''...... بیگم احساس نے ''خوشۂ گندم'' مانک ٹالا نے ''باسی بیل'' ''گناہ کا رشتہ'' صلاح الدین پرویز نے ''نمرتا'' (ناولٹ)۔ محسن علی نے ''لہو آستین کا'' محی الدین نواب نے ''بارود کے پھول'' ''کچرا گھر'' جمنا داس اختر نے ''آگ'' اور ''بردہ فروش'' لکھے۔ مظہر الحق نے ''زکالی'' ''منزل منزل'' ''موت کے سائے'' ''سورج کا لہو'' ''تارِ عنکبوت'' لکھ کر اپنی پہچان کرائی تو صدر آہ نے ''لال قلعہ'' ہر چرن چاولہ نے ''چراغ کے زخم'' عادل رشید نے ''ایک دل ہزار غم'' جوگندر پال نے ''سلوٹیں'' ''آمد و رفت'' اور بیانات لکھے۔ نجم اعزاز نے ''سوز و ساز'' لکھا تو عطیہ پروین نے ''پھول کھلتے ہیں'' ''آنگن کی چاندنی'' ''بہاریں پھر بھی آئینگی'' اور ''زرتاج'' وغیرہ لکھے۔

بلقیس کنول نے ''سیپ'' (دو جلدوں پر مشتمل) لکھا تو بدر انجم نے ''شہید'' فرید ہانی نے ''زخم تمنا'' ایم سلطانہ فخر نے ''صبرین'' لکھا الیاس سیتاپوری نے ''یہ نوکِ خنجر'' ''تلاشِ حق'' ''ابنِ آدم'' ''خاقانِ اعظم'' ''گداز پتھر'' ''لذتِ آشنائی'' اور ''درویش کی بیٹی'' ''مجرم'' لکھے ہیں تو نسیم انہونوی نے ''رحمت'' ''حسرت'' ''کہکشاں'' ''ارماں'' ''خاتون'' ''آخری تمنا'' ''سراب زندگی'' اور ''شگفتہ'' وغیرہ، رضیہ فرحت نے ''شبنم شبنم آنسو'' نیلو فر راجہ نے ''نازیہ'' رضیہ جمیل نے ''ایک لڑکی پاگل سی''، ایم۔ اے شمشاد نے ''گستاخ''، شیریں گل درانی نے ''سریتا''، مسرور جہاں نے ''اچانک'' ''درد کا ساحل'' ''رشتہ پیار کا'' ''میرے حضور'' ''تیرے نگ'' رام لال نے ''نیلا دھارا''، کرم کاشمیری نے ''خوابوں کے قافلے''، ناز کفیل گیلانی نے ''بت

ارضی'' زبیدہ سلطانہ نے ''فیروزہ'' ''سدرہ'' ''ابر بہاراں'' وحیدہ نسیم نے ''زخمِ حیات'' ''داستانِ درد داستان'' سیدہ ماجوہ خاتون نے ''آہٹ'' اور ''سونا سونا آنگن'' اسی طرح مینا ناز نے ''دو سکھیاں'' ''صنم'' ''نفرت'' اور طلاق اے آر خاتون نے ''بالہ'' عابدہ نسرین نے ''عفا'' اور فردوس حیدر نے ''نقوشِ قدم'' وغیرہ لکھے۔

ناولوں اور ناول نگاروں کی اس جنگلاتی فہرست سے (جس میں بہت سے نام قصداً چھوڑ دیئے گئے ہیں اور کچھ طوعاً وکرہاً شامل رکھے گئے ہیں) جو ایک مجموعی رائے اردو ناول کے متعلق قائم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے ناول نگار جس موضوع کے بھی پیچھے پڑے اس سے پورا مجموعی بلاتکار کیا۔ اگر طوائف سازی/ طوائف بازی، طوائف زدگی، طوائفوں کی برانگیختگی اور مظلومیت کو پکڑا تو مدتوں نہ چھوڑا، اگر پہلی جنگ عظیم، دوسری جنگ عظیم کے پس منظر، پیش خیمہ کو لیا تو اُسے بھی بری طرح خراب کیا، مغربیت و مشرقیت کی متضادیت کا پیچھا کیا تو ہر ایک یہ ثابت کرنے پر مصر رہا کہ صرف اور صرف اس نے ہی مغربیت کو سب سے زیادہ پڑھا ہے یا سمندر پار کے ملکوں کا دورہ اُسی نے کیا ہے اور یہ کہ مغربی زندگی کا بہت قریب کا مشاہدہ صرف اور صرف اسے ہی ہے جاگیردارانہ نظام اور مختلف سطحوں پر اس سے پیدا شدہ استحصال کو لیا تو اُسے ہی لیا، فلمی دنیا کی بے راہ روی پر لکھنا شروع کیا تو بھی تھوک کے بھاؤ لکھا، تقسیم ملک، ترک وطن یا لکھنؤ اور حیدرآباد کی زوال آمادہ تہذیب پر لکھا تو بھی خوب لکھا۔ مگر اب ایسا لگتا ہے کہ ان سوتوں میں پانی سوکھ گیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ناولسٹوں میں غالب اکثریت خواتین کی ہے اور انھیں میں کچھ پلے بیک (Play Back) نام بھی ہیں انھیں سے جو نیک نام/ بدنام/ گمنام/ بے نام ناول/ ناولسٹ ہیں وہ مختلف ادبی گروہ بندیوں کی عیارانہ سازشوں اور سیاستوں کے المیہ کا شکار

ہیں۔ ایک مدت تک پریم چند کا سکہ اردو میں چلا انھوں نے غبن، گودان، کایا کلپ، رنگ بھومی، کرم بھومی، نرملا، سیوا سون اور پرتگیا (ان میں سے بیشتر ہندی میں) لکھے اور اردو میں امر ہو گئے۔ پریم چندر کی طرح اپندر ناتھ اشک بھی پہلے اردو میں ہی لکھتے تھے مگر پھر ہندی والے ہو گئے، انھیں دوام اردو والوں نے بخشا۔ ستاروں کے کھیل، گرم راکھ، گرتی دیواریں، بڑی بڑی آنکھیں منیشا وغیرہ اپندر ناتھ اشک کے مشہور ناولوں میں سے ہیں دستاویز، پہل، آجکل، نیا پرتیک، آلوچنا، اور سمبھاوُنا وغیرہ کے متعدد شماروں میں ہندی کے تازہ کار اور نوجوان ناولسٹوں میں اُن کی مختلف جہتوں پر کافی لکھا گیا مگر اردو میں ناول کے متعلق لوگ مغربی دانشوروں کے جملے یا اُن کے ترجمے استعمال کرتے ہیں۔ کسی پہلے سے طے شدہ بڑے ناولسٹ کا کوئی ناول مارکیٹ میں آنے سے پہلے ہی جو اس کے مشتہری کی جوڑ توڑ ہے وہ بھی بڑے معنی رکھتی ہے۔

لائبریریوں تک اُس کی رسائی اور کچھ پیشہ ور نقادوں اور مبصروں کی چشم التفات اگر نہ ملے تو ناول الگ پٹ جاتا ہے۔ بہ حال اکانامکس کے مارکیٹ کی پوری سیاسیات کا الگ سے لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ تب چل کے امید کی کوئی کرن پھوٹتی ہے۔ چنانچہ یار لوگوں نے اگر بعض پر لکھا تو اس قدر لکھا کہ باتوں باتوں میں عرش پر بیٹھا دیا۔ رات کے رات بین الاقوامی شہرت بخش دی۔ اور نہ لکھا تو بالکل طوطا چشمی اختیار کر لی یا قطعی آنکھیں ہی بند کر لیں۔ یعنی جن ناول نگاروں کی تنقیدی پشت پناہی اچھی ہے میرا مطلب ہے مضبوط ہے وہ جو چاہیں لکھ ماریں ادبی حلقوں میں اس کے خوب ڈنکے بجیں گے اور الگ الگ زاویوں سے اس کے Spectrograph پیش ہوں گے۔

اُدھر ''نفس ناول'' کے متعلق لوگوں نے متضاد باتیں بڑے دھڑلے سے کہی

ہیں۔ جو خط (پوسٹ کارڈ) لکھ سکتا ہے وہ افسانہ لکھ سکتا ہے (تو جو ایلڈ لیٹر لکھ دے وہ ناولسٹ)

☆اردو ناول کی موت ہو چکی ہے

☆اردو ناول ابھی پیدا ہی نہیں ہوا ہے

اردو ناول اپنی ہمہ جہت خصوصیات کی بناء پر بین الاقوامی سطح پر اپنی شناخت کرا چکا ہے۔ یہ زندگی کے قریب ترین ہے۔

اردو ناول میں اوڑھی ہوئی پسندی اور مثالی کرداروں کی بھرمار ہے اس لیے اس نے ابھی داستان سے مکمل طور پر فارغ خطی حاصل نہیں کی ہے۔

اردو ناول کی فضا اور ماحول درآمد شدہ ہے جس سے بناوٹ جھانکتی اور ناول کے کردار لیبل کردار LABEL CHRECTION ہیں۔

ایک جرمن دانشور نے جب یہ بیان دیا کہ ناول نگاری بیوقوفی ہے تو اس سے سوال کیا گیا کہ آپ کی رائے میں بے وقوفی کون سے درجے کی؟ اس نے پھر جواب دیا تیسرے درجے کی! سوال پھر ہوا پہلے درجے کی بیوقوفی کیا ہے؟ جواب پھر ملا، پہلے درجے کی بیوقوفی وہ ہے جو یہ بتائے کہ ناول نگاری بے وقوفی ہے! ایک اور سوال برجستہ ہوا، تو آپ کون سے درجے کے بیوقوف ہوئے؟ اس نے بے تامل جواب دیا وہی پہلے درجے کا، مگر ناولسٹ نہیں! اس سے معاملہ اور الجھ گیا۔ جس کو سمجھانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ سب سو جائیں ۔ میں سو بھی جاؤں تو خوابوں جاگ جاتا ہوں (خواب افلاکی) اس جاگرن میں جالنا کم کی طرح کسی طلسمی دیار میں دوڑ دھوپ مارپیچ کی بھاگ دوڑ سے کم نہیں، ظاہر ہے کہ آگ کے بجھے ہوئے شعلوں سے اڑ جانے والی راکھ کی نقاب کشائی سے جسم کی لرزیدگی میں سنجیدگی آجاتی ہے۔ لکنت

زباں اور ید بیضا کی ثبت ہر من سے سورۂ ابراہیم کا تعلق غرور کی برقاب آگ اور اس میں نہال متزلزل درجۂ حرارت ایک سانحہ کی صورت لمحہ لمحہ ٹپکتا ہے اور تحت الثریٰ میں لٹکے اسرافیل کے دونوں پاؤں اور ملک الموت کے ہاتھوں کی گرفت میں پرانی تختی جس پر روہانسی ہنسی ہنستا ہوا ایک ایک نام ایک ایک ناولسٹ کا نام ایک ایک بے وقوف کا نام تیسرے درجے کے بیوقوف کا نام پہلے درجے کے بیوقوف کے بقول۔ ان ناموں میں کچھ نام تو انفرا اور الٹرا شعاعیں INFRA AND ULTRA RAYS کھا جاتی ہے۔ باقی سات رنگوں میں بٹ جاتے ہیں جنہیں پھر اوسٹ والڈ چکّی (OSTWALD'S DISE) کو بجلی سے گھمانے پر روشنی ملتی ہے ایک رنگ کی روشنی، سارے رنگ مل کر ایک محلول روشنی پیدا کرتے ہیں۔ اور تب شناخت ہوتی ہے ہزاروں ضمیروں میں کسی خاص اسم کی مثلاً نذیر فتح پوری کی نذیریں نظیریت / بے نظیریت کا نون کتنا عظیم ہے اس کا جواب ''چٹانوں کے بیچ'' مطبوعہ ۷۵ء بھی نہ دے سکی ہر چند کہ اس نے ایک ارتعاشی چہ میگوئیوں کا ہیجان انگیز دھماکہ کیا جس کی پوری دھمک پر اور دھمک کی شدت پر سائلنسر (SILENCER) کا کام کیا اس سے برتی گئی نقادین کی چشم پوشی نے چنانچہ اس کس مپرسی کے بے ولولہ سیاسی انحطاط نے کچھ جولانیاں از سرِ نو نذیر کو دیں اور ''زخم اور آئیں'' جو نذیر کا دوسرا باضابطہ اور مستقل ناول ہے منظر عام پر آیا۔ اس کی نظیریت میں نون بھی ہے اور خون بھی ''چٹانوں کے بیچ'' سے زیادہ ہی سخت گیر اور پیچیدہ مگر دستیاب۔

اصل میں نذیر فتح پوری بھی بے پناہ آدمی ہے شاعر بھی اور ناول نگار بھی، یوں تو انھوں نے جیسا کہ اعلان کیا ہے عنقریب دو مزید ناول شائع ہونے والے ہیں ''چلتے چلتے'' اور ''کرن کا پیار'' مگر مجھے ان کا صرف ایک ناول ''زخم اور آئیں'' دیکھنے کا

اتفاق ہوا۔ یہ ناول ایک مربوط پلاٹ پر تعمیر کیا گیا ہے ۔ خالص رومانی PLYTYSE ہوتے ہوئے بھی یہ ناول معاشرتی ،تہذیبی ، مذہبی اور اخلاقی سب پہلوؤں کو سمائے ہوئے ہے۔اس میں ایک نوجوان ہے جورات کو اپنے دوست کے گھر سے واپسی میں ایک خاتون کو جو درد زہ کی وجہ سے تڑپ رہی ہے وہ اُسے لے کر ہسپتال جاتا ہے وہاں وہ ایک بچے کو جنم دیتی ہے ۔ یہ خط مستقیم سا پلاٹ ہے مگر ہسپتال کی نرس کا التفات اس میں مختلف فلیش بیک FLASH BECKS پیدا کرتا ہے اور بہت سے منحنی خطوط اس خطِ مستقیم سے مزید پیدا ہوتے ہیں اور عجیب عجیب جیومیٹریکل شکلیں بناتے ہیں اور الیکز نڈر سولینٹس کے ''کینسر وارڈ'' اور البرٹ کامو کے بیگانے کے پلاٹوں کی طرح پلاٹ کو چٹپٹا پن اور سنبھلی ہوئی کیفیت کا ذائقہ بخشتے ہیں۔

نذیر کا انداز بیان جگہ جگہ مختلف الجہت متحرک مگر پر اسرار ہو جاتا ہے اور گاہ بگاہ لطیف طنز اور مزاح کی چاشنی بکھری بکھری پڑی ہے۔مظہر الحق کے ''زکالی'' کی طرح کہانی بڑی پاکیزہ اور صاف ستھری ہے ۔ یہ کہانی پونا میں ہی جنم لیتی ہے وہیں پلتی بڑھتی ہے اور جوان موت مرتی ہے۔

اس ناول میں کل ملا کر انیس کردار ہیں۔ مرد کرداروں میں تنویر/ عارف مرکزی کردار ہے اور باقی متوازی یا ضمنی نیز نندلال ایک سکھ نوجوان ہے جو عارف/ تنویر کا دوست ہے ۔اور ایک ایکسیڈنٹ میں اپاہج ہو جاتا ہے ، رشید، تنویر کا بے تکلف دوست ہے۔ بڑا منچلا اور بے جھجک لڑکیوں کے معاملے میں خاص طور سے بیحد دل پھینک ، سیٹھ حشمت (نجمہ کا باپ) ، مہر النساء کے والد (جن کو کوئی نام نہیں الاٹ کیا گیا) شاہد اشفاق (نجمہ کا خالہ زاد بھائی) جس کی نجمہ نے مہر النساء/

شہ نظر سے شادی کرادی تھی، الیاس اور سنیل رمیش اور اُمیش ۔ خاتون کرداروں میں مہر النساء/ شہ نظر کہانی کی ہیروئن ہے اور شبانہ (ہسپتال کی خوبصورت اور جواں سال نرس جو خود بھی مرکزی کردار ہے یا مہر النساء کا متوازی کردار سمجھیے۔ نجمہ، فرزانہ، مہر النساء/ شہ نظر کی والدہ (انھیں بھی کوئی نام نہیں دیا گیا) سنیل، روبینہ، روما، زیب، بجلی، اور سیٹھ حشمت کی بیگم (نجمہ کی والدہ)

تنویر/ عارف، مہر النساء/ شہ نظر کی مرکزی کرداریت مقناطیس کے دو مخالف قطبوں کے آمنے سامنے رکھے ہونے پر ان کے مقناطیسی میدان میں بننے والی خطوط قوت LINES of FORCES کے طرح رشتہ رکھتی ہے اور نسیم انہونوی کے ناول ''نجمی'' سے بات شروع ہوتی ہے اور ملاقات کا سلسلہ نکلتا ہے۔ ناولوں کے توسل سے خط و کتابت چلتی ہے۔ تنویر کی بھابی اپنے دیور کے لیے معاون کردار ادا کرتی ہے اور ہر جگہ خوبصورت طور سے تنویر کی راہ ہموار کرتی ہے۔

اُسے عشق کے لیے حوصلہ بخشتی ہے۔ مہر النساء کی سہیلی فرزانہ عشق کی اگلی منزلوں میں بھرپور معاونت دیتی ہے۔ ان کی راز دارانہ ملاقات کرانے میں رام بان کی طرح اچوک نشانہ مارتی ہے (بہانہ تراشتی ہے) اُسے خود اپنے خاندان کے لوگوں کے ساتھ حاجی ملنگ کے مزار پر جانا ہے اور اس لیے وہ مہر النساء کی والدہ سے کہہ کر اُسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے راضی کر لیتی ہے اور پھر مہر اور تنویر (جواب عارف ہو گئے تھے) دراصل عارف تنویر کا دوسرا نام ہے جو مہر النساء نے پیار میں تجویز کیا تھا اور اسی طرح شہ نظر بھی مہر النساء کا دوسرا نام ہے جو پیار میں تنویر نے تجویز کیا تھا) درگاہ کے بجائے ایک ہوٹل میں رات گذارتے ہیں۔ ایک یادگاری رات، دو جوان دلوں کی محبت کی ملاقات کی رات۔ نجمہ سیٹھ حشمت کی جوان بیٹی ہے

جسے ہر وقت ایک مرد کی ضرورت رہتی ہے خواہ وہ کسی بھی عمر کا کیوں نہ ہو۔ کلاس کے سارے ہی لڑکوں کے ساتھ فلمیں دیکھتی ہے اور دکھاتی ہے وہ تنویر کو بھی پھنسانے کی کوشش کرتی ہے مگر تنویر جب کوئی التفات نہیں کرتا تو انتقام کا ایک جذبہ اس میں پیدا ہو جاتا ہے اور پھر ناول کی کہانی بڑے بڑے نازک موڑ لیتی ہے۔

نجمہ ہی اس ناول کی تقدیر لکھتی ہے۔ شہ نظر اور عارف کی محبت میں زبردست تغیر لاتی ہے۔ شہ نظر کی شادی اپنے خالہ زاد بھائی اشفاق سے کرا دیتی ہے۔ شہ نظر کی والدہ اور والد سیٹھ حشمت کے مال و دولت سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور اس امید پر کہ سیٹھ حشمت کی تو اُسے پوری سرپرستی ہے اپنی لڑکی کی شادی اشفاق سے کر دیتے ہیں۔ خود شہ نظر بھی یہ شادی کسی قابلِ ذکر احتجاج کے بغیر قبول کر لیتی ہے اُسے بھی پیسے کی چمک دمک عزیز ہے۔ اور وہ ایک غریب کا دل توڑ دیتی ہے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی نجمہ یہ بھی کرتی ہے کہ شہ نظر اور اشفاق کو بحرین بھیج دیتی ہے (شہ نظر کو عارف سے دور تر) اور اشفاق کو جو اس کا خالہ زاد بھائی ہے اور جسے سیٹھ حشمت اپنے لڑکے کی طرح اپنے پاس رکھتے تھے اپنے باپ کی جائداد سے قطعی بے دخل کر دیتی ہے نیز بری طرح جلا جلا کر عارف کو کباب کرتی ہے (وہ خود جو انتقام کی آگ میں جل رہی ہے) شہ نظر محبت کی دیوی بھی رہی مگر اس کا جھکاؤ پیسے کی طرف نسبتاً زیادہ رہا۔

نندلال ایک سکھ نوجوان ہے اور یوں ہی بس تنویر سے اس کی دوستی ہو جاتی ہے یہ شخص ایک حادثے میں اپنی ٹانگ کھو دیتا ہے دونوں بے تکلف دوست ہیں اور دونوں محبت کے مارے ہوئے بھی۔ رشید بڑی ہلکی طبیعت کا مالک ہے بڑا تفریح باز اور پل پل لڑکیوں میں کھیلنے والا، منٹ منٹ بعد نئی لڑکی دوست بدلنے والا (شاید وہ لڑکیوں کے بغیر زندہ رہ ہی نہیں سکتا) اس کے مزاج میں بلا کی بذلہ سنجی اور ظرافت

ہے اور بات بات میں لطیف طنز کے خوشگوار تیر ونشتر۔

اُمیش ، رمیش ،سنیل ،سنیلا ، روبینہ ، روما ، زیب ، شاہد ،بجلی وغیرہ کچھ اور کردار ہیں ۔ یہ کردار بالکل رسمی اور لمحاتی ہیں ان میں سے چند تو صرف برائے نام ہیں اور چند کا کام بہت مختصر ہے مگر یادگاری بن گیا ہے ۔ فرزانہ ایک زندہ دل اور سروس کلاس لڑکی ہے جو بلا کی جہاندیدہ اور موقعہ شناس ، وہ معاون کردار کے ساتھ ساتھ اس ناول کی ایک ذمہ دار اور ایک وحدت میں مربوط کردار ہے۔

کہانی کے متعدد محوروں پر فرزانہ ہمیں مختلف پاسداریاں نبھاتی ہوئی ملتی ہے اور شبانہ تو جیسا میں نے پہلے عرض کیا بہت حد تک متوازی کردار ہے ۔ اسی کی زندگی میں الیاس ایک کانٹے کی طرح چبھتا ہوا بدکار کردار ہے جس کی آنکھیں ، نیت خبیث اور ذہنیت ذلیل ہے۔

مہرالنساء شہ نظر کے باپ کا رول بڑا ہی بردبار سنجیدہ اور دوررس ہے ان کی چھٹی حس ہمیشہ بیدار رہتی ہے ۔ مہرالنساء/ شہ نظر جب اپنی سہیلی فرزانہ کی مدد سے گھر سے بابا ملنگ کے مزار کی حاضری کا بہانہ بنا کر رات بھر کے لیے غائب ہوتی ہے اور طوفان بارش کا ہنگام ہوتا ہے تو وہ بے حد متفکر ہو جاتے ہیں ۔ اپنی جوان بیٹی کے یوں گھر سے باہر رہنے پر انھیں طرح طرح کے خیالات آتے ہیں ملاحظہ ہو یہ اقتباس ۔

''ہوا بہت زور سے چل رہی ہے ۔ شاید طوفان آنے والا ہے۔''

انھوں نے اتنا جواب دیکر چند لمحے سکوت کیا پھر ڈوبی ہوئی آواز میں بولے۔

''کہیں اس طوفان کی زد میں ہمارا گھر نہ آجائے۔''

''آپ کا تو دماغ چل گیا ہے ۔ بھلا سیمنٹ سے بنے ہوئے پختہ گھر اس ہوا کے معمولی جھونکوں سے نقصان اٹھا سکتے ہیں۔''

''سیمنٹ اور اینٹوں سے بنی ان پختہ دیواروں کا نام گھر نہیں مہر کی ماں!

ہمارا گھر تو ہماری بیٹی ہے۔مہر ہے۔'' وہ انتہائی فکر مند لہجے میں بولے مگر آپ اس کی طرف سے اس قدر پریشان کیوں ہیں؟

تم اس باپ سے اس کی پریشانی کی وجہ پوچھ رہی ہو جس کی جوان بیٹی رات کے اس گہرے سناٹے میں گھر سے باہر ہو۔تم ذرا سوچو کہ اس وقت تمہاری جوان بیٹی کہاں ہوگی، کہاں وہ رات کو سوئے گی، کون اس کا محافظ ہوگا؟

''عورت دو ہی جگہ محفوظ رہ سکتی ہے۔ایک باپ کے گھر دوسرے شوہر کے گھر ''اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے اور کچھ سوچنے لگے۔

کچھ دیر خاموشی رہی اس کے بعد وہ پھر بولے۔

اب ہمیں اچھا سا لڑکا دیکھ کر اس کے ہاتھ پیلے کر دینے چاہییں۔میرا جنازہ اٹھنے سے پہلے مہر کی ڈولی اس گھر سے اٹھ جائے تو بہتر ہے۔'' اتنا کہتے کہتے اُن کی آنکھیں بھیگ گئیں۔''

خط کشیدہ جملے خاص طور سے دیکھیں اُن سے کس قدر تجزیہ اور تجربہ جھلکتا ہے کس قدر سچ سوچ رہے ہیں۔وہ یوں بھی لڑکیوں کی آزادی کو اس قدر پسند نہیں کرتے کیونکہ اس سے جو دیگر ممکنہ خدشات اور ممکنہ حادثات ہو سکتے ہیں اس سے وہ پہلے سے خبردار ہیں۔ سارے ہی کرداروں میں بے حد وابستگی اور تعلق ملتا ہے انسانی رشتوں کی پیچیدگیوں کے ساتھ وہ آپس میں مختلف مثلث اور مستطیل بنائے ہیں جن سے جگہ جگہ الگ نوکدار اور وضعدار شاخیں پھوٹتی ہیں۔

راجہ بیٹا، روبینہ، او ما برائے نام ہیں بے مصرف اور غیر ضروری ہوتے ہوئے بھی بڑے مصرف کے اور ضروری۔اُن کے متماثل کردار مسعود جاوید کے ''شیطان

کے پجاری‘‘ اور نجم اعزاز کے ’’سوز و ساز‘‘ میں ملتے ہیں۔

’’زخم اور آئیں‘‘ حالانکہ ایک ہی شہر (پونہ) کی کہانی ہے جو اس کے مختلف محلوں اور وزیٹنگ اسپاٹ VISITING SPOTS کے گرد گھومتی ہے ایک دو مقامات پونہ سے باہر کے بھی ہیں۔ کلیان میں بابا ملنگ کی درگاہ اور بحرین (سمندر پار کا ایک غیر ملک) جہاں اشفاق اور مہر النساء کو بھیج دیا جاتا ہے۔ یہ سارے ہی مقامات کہانی کی جاذبیت میں تہذیبی طرز احساس میں زندگی اور تابندگی بخشتے ہیں۔

گنیش پیٹھ جہاں شبانہ (ہسپتال کی نرس) کا گھر ہے، گلابی نگر اس علاقہ کا نام یہاں عارف رہتا ہے سب یادگاری مقامات بن کر رہ گے ہیں۔ ان کے علاوہ لکی ریسٹورنٹ، سارس باغ، شیوا پور حضرت قمر علی شاہ درویش کا مزار، کاترج کا اندھیارا غار، مہاتما گاندھی پارک، چندن ہوٹل ناز ہوٹل کی سیر و سیاحت، نشست و برخاست سب ناول کو ایک مضبوط CHIASME عطا کرتے ہیں۔

اس ناول میں چیدہ چیدہ اخلاقی، جذباتی، تہذیبی اور مذہبی قدریں ملتی ہیں۔ مختلف معاشی مسائل اور زمانی جبر سانیاں۔

ماں کے متعلق یہ سطور دیکھیے ’’ماں قدرت کی سب سے بڑی دین‘‘ دنیا کا سب سے مقدس روپ اولاد کی سب سے بڑی نگہبان جذبات کی گہرائیوں سے ہٹ کر دل کی گہرائیوں سے تعلق رکھنے والا مضبوط اور پائیدار رشتہ!

اور شبانہ (ہسپتال کی نرس) کے یہ جملے ’’آپ گھبرائیں نہیں! ہمت سے کام لیں اور خدا سے دعا کریں۔ دعا مومن کا سب سے بڑا اہتھیار ہے۔‘‘

’’جس وقت آپ نے مجھے رکشہ میں اپنی جگہ بٹھایا تھا اس وقت میں سمجھ گئی تھی کہ آپ کا اس عورت سے کوئی ازدواجی رشتہ نہیں ہے۔ آپ محض ہمدردی کے تحت

اسے یہاں تک لائے ہیں۔''

تنگ نظری فرقہ بندی اور دیر وحرم کے امتیاز کو اگر آپ مذہب سمجھتے ہیں تو یہ کہوں گی کہ میرا کوئی مذہب نہیں! اگر ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی کو الگ الگ خانوں میں فٹ کر کے مجھ سے پوچھیں گے کہ میں کون سے خانے میں فٹ ہوں تو میں بلا خوف و خطر کہوں گی کہ کسی میں بھی نہیں میں نے ہمیشہ انسانیت کو فوقیت دی ہے۔ میں خدا کی ذات اور وحدانیت پر یقین رکھتی ہوں۔ مگر میرا خدا صرف میرا ہی خدا نہیں ہے بلکہ وہ تمام جہانوں کا رب ہے۔ اُس کے شناختی نام مختلف ضرور ہیں مگر اس کا وجود ایک ہی ہے۔ جب مسجد میں اس کے نام کی اذان ہوتی ہے، تو مندر کے گجر بھی اسی کا نام پکارتے ہیں۔ وہ پاک اور بے عیب ہے۔'' یکتا اور یگانہ ہے۔''

اس ناول کے بیشتر مکالمے جو مختلف مقامات اور نوعیتوں سے کہے گئے ہیں اس درجہ پیش گوئی اور خوش اندازگی سے لکھے گے ہیں کہ جہاں وہ کرداروں کی مزاجی شگفتہ روی پر دال ہیں وہاں سماعقیدوں کی وسعت وشکست وریخت اور سماجی قید وبند (روا/ ناروا) سے عاری بھی اور زمانی جبر کی غمازی بھی کرتے ہیں۔

عارف وشہ نظر کے یہ مکالمے.........

''جب دل نے تم کو پسند کرلیا تو تمہاری ہر ادا پسند ہے۔''

''بے وفائی کی ادا بھی پسند ہے۔''

''ایسا مذاق مت کرو مہر! میں پاگل ہو جاؤں گا۔''

''ارے تم تو اتنے سنجیدہ ہو گئے جیسے میں سچ مچ بے وفائی پر اُتر آئی ہوں۔''

''تم بے وفائی نہیں کرسکتیں۔''

''آدمی جان بوجھ کر کچھ نہیں کرتا عارف! مگر حالات اُس سے سب کچھ

کروادیتے ہیں۔''

دراصل اسی گفتگو پر پورا ناول کھڑا ہے۔

نذیر فتح پوری چونکہ ایک جواں سال ناول نگار ہیں اس لیے ناول کی رومانی منزلتوں اور منزلوں میں اُن کا قلم زیادہ مشاہداتی ہونا تو فطری لگتا ہے مگر جہاں بزرگوں کے مکالمے اور تجربے انھوں نے بیان کیے ہیں (مہر کے والد کے خیالات جو ہم اوپر بھی حوالے میں پیش کر چکے ہیں) وہاں وہ روایت کے احترام اور زندگی کی تلخ و ترش صداقتوں سے پوری آگاہی رکھتے ہیں ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے معاشرہ کے ہر پہلو پر سنجیدگی سے سوچا ہے۔

لڑکیوں کی آپس میں چہلیں دیکھیے۔

''ارے دم کیوں نکلا جارہا ہے۔ایک دن ضرور سامنا ہوگا،مگر کہیں نظر نہ لگا دینا۔

''اگر تجھے اتنا ہی ڈر ہے تو اپنے چاند کے چہرے پر کاجل کا ٹیکا لگوادے۔''

''تو ہی اپنی آنکھوں میں کاجل ڈال کر آنا۔''

میں تو اپنی آنکھوں میں کاجل ڈال لوں گی۔مگر دوسرے دیکھنے والوں کی آنکھوں میں تو مرچ ڈال دینا۔''

اور اسی طرح بے شمار مقامات میں جوند میری NOUELISTE GENIES کو مجرد اور FALCIFARW ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔

نرسوں اور لیڈی اسکول ٹیچروں کو ہمارے معاشرے میں کچھ مشکوک نظر سے لوگ دیکھتے ہیں۔ یہاں ہسپتال کی نرس شبانہ کے متعلق یہ خیالات اس کے دماغ میں گردش کررہے ہیں۔

''عام طور سے نرسیں بڑی رنگین مزاج اور آزاد طبع ہوتی ہیں۔''

''نرس جس نوجوان کو پسند کرتی ہے اسے قبر تک نہیں چھوڑتی۔''

''نرسوں کا پھینکا ہوا جال کبھی خالی نہیں جاتا۔''

رشید نے تو یہاں تک بتایا تھا ایک ایک نرس بیک وقت کئی کئی عاشقوں سے عشق لڑاتی ہے۔ ہر عاشق کا وقت مقرر ہوتا ہے، اور دوائے دردِ دل لے کر چلا جاتا ہے......وغیرہ۔

اور مولویوں کے متعلق یہ جملے بہ ملاحظہ فرمائیں۔

فرزانہ اور مہر کی گفتگو......

''یہ چائے ہے یا ہفتے بھر کا کھانا؟ مجھے بھی کیا کوئی پیٹو قسم کا مولوی سمجھ لیا ہے؟''

''کیا مولویوں کے ہی پیٹ ہوتا ہے۔''

''سنا ہے کہ مولوی اور پیر قسم کے لوگ کھانے میں بڑے مشاق ہوتے ہیں۔''

کرشن چندر اور نسیم انہونوی کے ناولوں کے حوالے سے دونوں کے متعلق تنویر مہر النساء اور فرزانہ کے مکالموں کے ذریعے عبوری رائے بھی دیکھیے جو غیر سنجیدہ ہوتے ہوئے بھی قابل توجہ ہے۔

حکم کے مطابق کرشن چندر کا ناول بھجوا رہی ہوں۔ بڑی تلخ اور زہریلی تحریر ہے۔ محبت کے ابتدائی مراحل طے کرنے والوں کو قطعی پسند نہیں آئے گی کیونکہ اس ناول کا کردار جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے ''دادر کے پل کے نیچے'' یہ ان لوگوں کی کہانی ہے جن کی زندگی کانٹوں کا جنگل، خزاں رسیدہ چمن اور خشک ندی سے عبارت ہے۔

''نجمی'' ناول کے متعلق جب تنویر نے پوچھا کہ اس کا رائٹر کون ہے تو مہر نے جواب دیا ''نسیم انہونوی''

''کرشن چندر ہوتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔'' تنویر نے پھر شرارت کی، اگر اس

کتاب کے رائٹر کرشن چندر ہوتے تو کتاب کا نام ''دادر کے پل کے نیچے'' یا ''ایک منزل ہزار دیوانے'' ہوتا۔ مہر نے جھلا کر جواب دیا ''ہونے کو تو ''زرگاؤں کی رانی'' اور ''چنبل کی چنبیلی'' بھی ہو سکتا تھا۔

''کیا مطلب۔''

مطلب یہ کہ کیا تم نے زندگی میں کبھی کرشن چندر کی کوئی کتاب پڑھی ہے۔

پڑھی ہے ''الٹا درخت'' مگر مجھے نسیم انہونوی کی کتابیں زیادہ پسند ہیں۔

تمہیں نسیم انہونوی اس لیے پسند ہیں کہ ان کا قلم سہل اور زبان آسان ہوتی ہے۔ جو تم جیسی سہل پسند لڑکیوں کی سمجھ میں آسانی سے آجاتی ہے۔

اس کے علاوہ وہ کہیں کہیں مکالموں کے ذریعہ ایک منضبط نظم کی سی فضا بھی تخلیق کرتے ہیں۔

''عشق''

ڈھم''

''دھوکہ''

''فریب''

''خود غرضی''

''عہد فراموشی''

''مصلحت اندیشی''

''کتنے روپ ہیں عشق کے''

''کتنی شکلیں ہیں عشق کی''

''کتنے چہرے بدلتا ہے آج کا عشق''

”گرگٹ کی طرح بے شمار رنگ !“

اس اقتباس میں دیکھیے ۔ یہ صرف پونہ شہر کا ہی المیہ نہیں ہمارے ہر شہر کا ہر گاؤں المیہ ہے“ مانا کہ ان کے پاس ڈگری ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم سے آراستہ و پیراستہ ہیں مگر اُن سے قوم کو کیا فائدہ پہنچا ہے ۔ انھوں نے ادب میں کیا گل کھلائے ہیں ڈگریوں سے انھوں نے پیسہ کمایا ہے ۔ دنیا پر رعب جمایا ہے، آپس میں لڑتے رہے ہیں، ایک دوسرے کی پگڑیاں اچھالی ہیں ۔ایک دوسرے کو گالیاں دی ہیں، ہمعصروں کے بارے میں ہتک آمیز باتیں کی ہیں ۔دانش وری اور دانش مندی کے دعویداروں نے آج تک سنجیدگی سے یہ نہیں سوچا کہ اتنے بڑے شہر میں اردو ادب کو فروغ دینے کے لیے کوئی تنظیم کوئی ادارہ کوئی سوسائٹی نہیں ہے، کوئی ایسا پلیٹ فارم، کوئی ایسا جھنڈا نہیں جس کے تلے نوجوان جمع ہو کر اردو کے لیے کوئی نعرہ بلند کرسکیں، اپنی آواز اٹھائیں، اردو کا حق مانگیں ۔اردو کا کوئی ایسا اخبار یا رسالہ نہیں جو وقت کی ضرورت کو پورا کر سکے۔

عورت کو ہمیشہ ایک نہ سمجھ میں آنے والی پہیلی مانا گیا ہے۔

MYSTRY INSIDEAN ENIGME ضدی اور انتقام کی آگ میں جلنے والی بھی ۔ ملاحظہ کریں نجمہ کے یہ الفاظ ”عورت جب خریدنے پر آتی ہے تو سب کچھ خرید لیتی ہے تنویر!“ ایک اور جگہ مہر کی مسکراہٹ پر تنویر نے پوچھا ”اب تمہاری مسکراہٹ کی کیا وجہ ہے؟“ ”عورت کی مسکراہٹ کا مطلب آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ عارف صاحب خود عورت بھی اپنی مسکراہٹ کا مفہوم نہیں بتا سکتی ۔“

نجمہ کا مکالمہ بھی دیکھیے ۔ ”بے وقوف ہو تنویر! جو بیسویں صدی کی عورت پر اتنا بھروسہ کرتے ہو۔“

اور شہ نظر کے یہ الفاظ '' جتنا وقت میرے پیچھے برباد کرتے ہو اتنا ہی وقت دولت کمانے میں لگاؤ تو لاکھوں کے مالک بن جاؤ گے اور پھر زندگی کی ساری مسکراہٹیں تمام آسائشیں تمہارے قدموں میں ہوں گی اور مجھ جیسی کئی لڑکیاں تمہارے آگے پیچھے...... آخر تمہیں میری دولت سے اتنی چڑ کیوں ہے، دولت ایک حقیقت ہے ایک سچائی ہے ایک ضرورت ہے! میں نے اُسے اپنا کر کون سا جرم کیا ہے؟ محبت کی باتوں سے پیٹ نہیں بھرتا۔ جذبات کی شدت سے مغلوب ہو کر کہے ہوئے جملے تجوری میں نہیں رکھے جاتے اور بازار میں بھی اُن کی کوئی وقعت نہیں۔''

اسی طرح بے پناہ مقامات ہیں جہاں ناول نگار نے زندگی کو ہر زاویے سے دیکھا ہے۔ ہوا کے مختلف رنگ اور سمت کو محسوس کیا ہے اور فنکارانہ طور سے انہیں اظہار دیا ہے۔ صدا بہار موضوع کے پس منظر میں اس ناول میں ہر عہد جی رہا ہے ماضی کی روایتیں بھی۔ ایک متوسط گھرانے کی کہانی ہونے کی وجہ سے پورا ناول ہمارے گھر کا سا لگتا ہے اس میں کسی نہ کسی جگہ کوئی نہ کوئی کردار ہر شخص جی رہا ہے کہانی مختلف ہموار/غیر ہموار مراحل سے افادی صورتحال کے ساتھ ساتھ گذرتی ہے جذبے کی شدت اور حدت کرداروں کی ملفوف اور غیر ملفوف نفسیاتی اور مصالحتی دشگا خیال مختلف سوالیہ نشان چھوڑتی چلتی ہے۔ یہ ایک خالص تہذیبی اور سماجی ناول ہے جو کامیاب ہے اور پوری ادبی اہمیت کا حامل ہے۔ ناول نگار ہر جگہ فنی تقاضوں پر پورا اترتا ہے زبان و بیان کے اغلاط سے بھی بہت صاف اور بے باک۔ یقیناً اس ناول نے نذیر کا ناول نگاری کا درجہ متعین کرایا ہے۔

****

"ریزہ ریزہ دل" میں چھوٹی چھوٹی با مقصد کہانیاں

مراق مرزا

ہزاروں لاکھوں سال قبل کا واقعہ ہے۔ کائنات کی بیکراں میں کہیں ایک حادثہ درپیش آیا تھا۔ وہ حادثہ آدم کی پیدائش کا تھا۔ اُس حادثہ کے ساتھ ہی اس عالم اسباب میں انسان اور انسانی زندگی سے وابستہ سب سے پہلی کہانی وجود میں آئی تھی۔ اس حقیقت کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کہانی اور حیات انسانی کے درمیان ایک ازلی ربط اور رشتہ ہے۔ دنیا کے اولین انسانی جوڑے کی کہانی خالقِ دنیا اور خالقِ انسان نے چند آسمانی کتابوں میں بذات خود بیان کی ہے۔ اس سچ کی بنیاد پر ہمیں یہ اعتراف کرنا ہوگا کہ دنیا کا سب سے پہلا کہانی کار خود اس دنیا کا رچنا کار ہے۔ بعدہ زندگی کی نشوونمائی نیز مختلف میدانِ عمل میں درجہ بہ درجہ ترقی کی داستان اس کرۂ ارض کے الگ الگ خطے میں اتارے گئے پیغامبروں، اولیاؤں اور اوتاروں نے الگ الگ زبانوں میں رقم کی ہیں۔ پوتر گرنتھوں اور مقدس کتاب کی شکل میں یہ کہانیاں آج بھی اولادِ آدم کو بصارت وبصیرت بخشنے کا کام انجام دے رہی ہیں۔

صفرِ حیات میں کہانی کی اہمیت وضرورت سے کسی بھی طور انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر زمانے میں کہانی کے ذریعے سے بہت سے اصلاحی اُمور انجام پذیر ہوئے ہیں، تہذیب وتمدن کی راہ میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ کہانیوں نے معاشرہ سازی اور ذہن سازی کے کاموں میں اپنا نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ لہٰذا یہاں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کہانی کہنے کا عمل غیر معمولی متانت اور ذمہ داری کا متقاضی ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ دنیا کے ہر ملک اور سماج میں کہانی کار کو عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا

ہے۔ بقول افلاطون ''بہادر افراد، فلسفی اور مفکرین کو خالق کائنات سونے سے خلق کرتا ہے۔'' افلاطون کے اس علامتی نظریہ کے پس پردہ انسانی سماج میں ایک حقیقی قلمکار کی اہمیت وحرمت کا راز پوشیدہ ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ایک ذمہ دار قلمکار جب بھی قلم اٹھاتا ہے وہ اپنے قلم کی طاقت سے جس حد تک ممکن ہو سکے ملک اور معاشرے میں پھیلی برائیوں کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔

''مدیر اسباق'' محترم نذیر فتح پوری بھی عصر حاضر کے ایک معروف بلند پایہ اور ذمہ دار قلمکار ہیں جن کا قلمی سفر بہ یک وقت مختلف سمتوں میں گزشتہ کئی دہائیوں سے جاری ہے۔ عالی مقام شاعر، معتبر محقق و ناقد اور زندگی سے جڑے موضوعات سے تحریک لے کر اچھی اور سچی کہانیاں لکھنے والے کہانی کار نذیر فتح پوری کی شخصیت بلا اشتباہ ہمہ جہت ہے۔ اس روئے زمین پر جہاں جہاں اردو کے گلستان آباد ہیں نذیر فتح پوری کے قلم کی خوشبو دیکھی اور محسوس کی جاتی ہے۔ گذشتہ دس بارہ برسوں سے اسباق نیز ملک و بیرون ملک کے دیگر رسائل و جرائد کے وسیلے سے وہ اکثر میرے مطالعے میں آتے رہے ہیں اور ان کی مختلف النوع تخلیقات نے میرے فکری کینوس پر ہمیشہ عمدہ اور مثبت اثرات مرتب کی ہیں۔ اس وقت میں ان کے منی افسانوں کا مجموعہ ''ریزہ ریزہ دل'' کے مطالعہ کے زیر اثر ان کی فکری بلندی اور تخلیقی عمیقیت کو سمجھنے کی سعی کر رہا ہوں۔

کہانی طویل ہو یا مختصر یا مختصر ترین اُس کے وجود کے لیے مشاہیر نے کچھ لازمی اجزا طے کیے ہیں جن کے بغیر کہانی کہانی نہیں بن سکتی۔ کسی بھی کہانی کا اولین اور اہم ترین جز اُس کا خیال یا مرکزی خیال ہوتا ہے جس کے توسط سے کہانی کار اپنے قارئین سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ یہ پہلا جز اس اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے کہ ایسی کہانیاں جن میں انسانی فکر و ادراک کو متحرک کرنے والی کوئی بات نہ ہو انہیں زندۂ جاوید کہانیوں کے زمرے میں نہیں رکھا جاتا۔ دوسرے دو اہم اجزا ہیں کردار اور

واقعات۔ یہاں وضاحت کی ضرورت نہیں کہ ان تینوں اجزا کے بنا کہانی کا وجود میں آنا ممکن نہیں ہے۔ طویل کہانیوں کے لیے کردار اور واقعات کا انتخاب کوئی مشکل مسئلہ یا مرحلہ نظر نہیں آتا مگر افسانچہ یا منی افسانہ کے تخلیقی عمل کی راہ میں ایک مضبوط خیال، دلچسپ واقعہ اور زندہ کردار کا Selection ایک کہانی کار کے لیے بلاشبہ کارِ سہل نہیں ہے۔ چند سطور میں ایک مکمل اور بامقصد کہانی کی تخلیق کے لیے کہانی کار کے فکرو شعور کا زندگی کے تجربات اور مشاہدات سے لبریز ہونا از حد ضروری ہے کہ اس کے بنا وہ کسی خیال کو خوبصورت اور بامعنی افسانچہ کا پیرایہ عطا نہیں کرسکتا۔ نذیر فتح پوری کے منی افسانوں کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے زندگی کو بے حد قریب سے دیکھا پرکھا اور سمجھا ہے۔ سفرِ حیات میں وہ بے شمار تجربوں اور مشاہدوں سے گزرے ہیں۔ لہٰذا اُن کے افسانچوں میں زندگی کے مختلف رنگ و عکس نہایت متاثر کن انداز میں ابھر کر سامنے آتے ہیں جنہیں قارئین دیکھ بھی سکتے ہیں اور اپنے احساسات کی وادیوں میں سجا بھی سکتے ہیں۔ چند افسانچے ملاحظہ فرمائیں :

خوش فہمی

جب وہ حصولِ علم کی آخری جنگ بھی ہار گیا
تو اس نے ساری دنیا کو جاہلوں کی بستی قرار دے دیا
اب وہ خوش ہے کہ دنیا اس کے برابر ہوگئی ہے

ترقی

آدمی نے کمپیوٹر بنایا
اور کمپیوٹر بننے کے بعد آدمی خود بگڑ گیا
کمپیوٹر کی خرابی آدمی دور کرسکتا ہے
لیکن آدمی کے بگاڑ کا علاج ؟!

یادرکھنے کی بات

نیچے اترنے والے کو اتنا نیچے نہیں اُترنا چاہیے

کہ اس کے بعد

زینے کا مقصد ہی معدوم ہو جائے

انجام کار

اور پھر یوں ہوا...... دوسروں کو مٹانے کی فکر میں

وہ خود مٹ گیا۔

آیئے درج بالا افسانچوں میں سے پہلے افسانچہ ''خوش فہمی'' کو پرکھ کر میزان پر رکھ کر جانچنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس افسانچہ میں کردار، خیال اور واقعہ تینوں اجزا موجود ہیں۔ حصولِ علم کی آخری جنگ ہار جانے والا فرد کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایک کردار ہے۔ Frustration میں اس کردار کا ساری دنیا کو جاہلوں کی بستی قرار دے دینا یقیناً ایک فکری واقعہ ہے۔ پھر یہ سوچ کر خوش ہونا کہ پوری دنیا اب اُس کے برابر ہوگئی ہے، دوسرا فکری حادثہ ہے اور اس دوسرے فکری حادثہ میں کہانی کار کی وہ بات پوشیدہ ہے جو وہ دنیا سے کہنا چاہتا ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی آنکھوں پر جہالت کا چشمہ لگا کر دنیا کو دیکھے گا تو ظاہر ہے اُسے ساری دنیا جاہل ہی نظر آئے گی۔ افسانے Moral یعنی مقصد اور Message کے بغیر بھی لکھے گئے ہیں۔ ترقی پسند دور کے ادباء نے تو افسانہ کی تصویر ہی بدل دی تھی۔ انہوں نے شاعری کی زبان میں علامتی افسانوں کی ڈھیر لگا دیا تھا لیکن اس دور کے زیادہ تر افسانے خالی المعنی تھے چنانچہ نہ وہ اپنے لیے قارئین پیدا کر سکے نہ ہی ادب میں ان کا کوئی مقام طے ہو پایا۔ کہانی جب زندگی سے جڑتی ہے تبھی اسے معیار و وقار ملتا ہے اور وہ مقبولِ عام بھی ہوتی ہے۔ منٹو، بیدی، کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس جیسے قلمکاروں کے افسانے آج بھی قارئین کو اس

لیے متاثر کرتے ہیں کہ وہ زندگی سے وابستہ ہیں اور اُن میں ہمارے گرد و پیش کے ماحول کی منظر کشی ہے۔

اوپر درج کیے گئے دیگر تین افسانچے بھی زندگی کے مختلف چہروں کے عکاس ہیں اور ہم سے کچھ کہنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ ''ترقی'' میں آدمی کے بگاڑ کو لیکر جو چبھتا ہوا سوال کیا گیا ہے اس سوال ہی میں اس افسانچہ کا Moral چھپا ہے۔ اگر چہ کمپیوٹر جیسی چمتکاری مشین کا موجد انسان ہی ہے تاہم انسان اس حقیقت سے کسی بھی طرح انکار نہیں کرسکتا کہ اس کی فکری پستی یا گراوٹ کا علاج نہ سائنس کے پاس ہے نہ علم طب کے پاس۔ اس مرض کا مداوا صرف علم و ادب کی روشنی سے ممکن ہے۔ ''یاد رکھنے کی بات'' میں جس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ حد سے زیادہ انکساری انسان کے اپنے وجود کے لیے بھی نقصاندہ ثابت ہوسکتی ہے۔ زینے چڑھنا ترقی کی منزلیں طے کرنے کا استعارہ ہے۔ جب زینے کا تصور ہی مٹ جائے گا تو انسان کے اوپر کی سمت چڑھنے اور بڑھنے کا عمل بھی بے معنی ہو جائے گا۔ ''انجام کار'' کی تخلیق میں کہانی کار نے صدیوں پرانا موقولہ:

(If you dig a grave for others. You are likely to fail yourself in to it)

جو دوسروں کے لیے قبر کھودتے ہیں وہ خود اس میں گر جاتے ہیں'' سے نہایت مفکرانہ طریقے سے استفادہ کیا ہے۔

''ریزہ ریزہ دل'' میں کل ایک سونو منی افسانے ہیں جو اپنے دامن میں معنویت و مقصدیت کے گلنار سجائے نظر آتے ہیں۔ یہ افسانے اپنے قارئین کو زندگی کے ایک بولتے ہوئے دلکش میوزیم کی سیر کراتے ہیں، جہاں فریب، مکر، زمانہ سازی اور موقعہ پرستی کی زہریلی ہوا بھی ہے اور خلوص و محبت، شرافت اور انسانیت کی زندگی سے بھرپور

صدا بھی۔ جہاں انسانی تہذیب اور کردار کے گرتے ہوئے معیار کی سسکتی کہانی بھی ہے اور پرانی قدروں کے مقابر پر بجھی ہوئی قندیل کی نشانی بھی۔ جہاں سمندر کی موجوں کا شور بھی ہے اور صحراؤں کا سکوت بھی۔ یہ افسانے ہمیں زندگی کے ان کرداروں سے روشناس کراتے ہیں جنہیں ہم اپنے گرد و نواح روز ہی دیکھتے ہیں مگر اپنے شعور کے طاقوں پر کبھی سجاتے نہیں۔ دراصل یہ ہمارے عہد کا المیہ ہے کہ ہم اپنے اطراف کی دنیا سے بے نیاز ہوکر آگے کی طرف سرپٹ دوڑتے جارہے ہیں۔ مادی مفادات کی حرص و ہوس ہمیں کچھ دیر کہیں رک کر اپنے اردگرد دیکھنے کی مہلت ہی نہیں دیتی۔ ہم ایک بجلی کی سی رفتار سے دوڑتی بھاگتی دنیا کا حصہ بن چکے ہیں۔ ایسے میں زندگی کے حقائق پر مبنی کوئی تخلیق جب نظر سے گزرتی ہے تو ہمارا ذہن چند ساعتوں کے لیے ٹھہر جاتا ہے اور ہم اس تخلیق کے آئینے میں کچھ پلوں کے لیے ہی ہی اپنا محاسبہ کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ شاید اسی لیے تخلیق کاروں کو ہر زمانے میں کچھ خاص احترام حاصل رہا ہے کہ قلم کی روشنی عوام الناس کے ساتھ ساتھ امیر و امراء اور شاہوں بادشاہوں کی راہ نمائی بھی کرتی رہی ہے۔

گو کہ اردو ادب میں سعادت حسن منٹو منی افسانہ کے موجد خیال کیے جاتے ہیں تاہم عالمگیر شہرت یافتہ قلمکار خلیل جبران کی تصنیف "The Mad Man and his Parables" میں بھی منی افسانے کی شکل میں چند سطری کہانیاں موجود ہیں۔ اسی کتاب سے ایک چند سطری کہانی ملاحظہ کریں:

"Yestereve, on the marble steps of the Temple, I saw a woman sitting between the two men. Ond side of her face was pale, the other was blishing."

''سنگ مرمر سے بنی مندر کی سیڑھیوں پر کل شام میں نے ایک عورت کو دیکھا،

جو دو مردوں کے درمیان بیٹھی تھی۔ اُس کے چہرے کا ایک حصہ قدرے غمگین تھا جبکہ دوسرے حصے پر شرمیلی مسکان تھی۔''

یہ کہانی چوں کہ ایک Mad Man یعنی پاگل آدمی کے ذریعے بیان کی گئی ہے اس لیے پوری طرح واضح نہیں ہے تاہم اگر ہم فکر کی آنکھوں سے دیکھیں تو اس خیال کے بطن میں چھپی کہانی کی تفہیم بہ آسانی ہو جاتی ہے۔ عورت کے چہرے کے ایک حصے پر اداسی اور دوسرے پر شرمیلی مسکراہٹ درحقیقت دونوں مردوں کے کردار کی علامتی عکاسی ہے۔ ایک مرد وہ ہے جو اس عورت پر عاشق ہے دوسرا وہ ہے جس سے عورت عشق کرتی ہے۔ خلیل جبران ایک عالی مقام قلمکار ہونے کے ساتھ ساتھ ورلڈ کلاس پینٹر بھی تھے۔ متذکرہ تصنیف The mad man میں خود کو پاگل کے کردار میں ڈھال کر انہوں نے بہت سی کہانیاں Abstract Painting کے انداز میں اشاروں کی زبان میں کہی ہیں۔

طالب علمی کے زمانے میں سعادت حسن منٹو کو میں نے بہت زیادہ پڑھا ہے لہٰذا ''سیاہ حاشیے'' کے بیشتر افسانے آج بھی ذہن کے اوراق پر محفوظ ہیں۔ منٹو کے علاوہ عصر حاضر کے جوگندر پال، رتن سنگھ، بشیر مالیر کوٹلوی اور صحافت سے وابستہ، رسائل وجرائد میں کم نظر آنے والے جواں سال قلمکار خاور حسین کے متعدد افسانچے بھی میرے مطالعے سے گزر چکے ہیں مگر ''ریزہ ریزہ دل'' کے کئی افسانچوں نے خلیل جبران کی کتاب The Mad Man کی یاد تازہ کر دی جو کئی برس قبل مطالعے میں آئی تھی اور آج بھی میرے بک شیلف میں موجود ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نذیر فتح پوری کے منی افسانے معیار اور مزاج کے اعتبار سے بلا اشتباہ اس قابل ہیں کہ انہیں ورلڈ کلاس افسانوں کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔

****

راجستھان کا مایۂ ناز افسانہ نگار۔ نذیر فتح پوری

ترنم (ریسرچ اسکالر)

نذیر فتح پوری اردو ادب میں محتاج تعارف نہیں ہیں وہ بہ حیثیت شاعر اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں اس کے علاوہ مختلف اصناف سخن میں ان کی تقریباً ۵۸ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ لیکن نثری میدان میں بھی وہ پیچھے نہیں رہے ہیں، ناول، افسانہ، مضامین، تاریخ، تحقیق سفرنامہ ان سب ہی اصناف مین وہ طبع آزمائی کر چکے ہیں۔

ان کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ''ریزہ ریزہ دل'' ۲۰۰۵ء میں شائع ہو چکا ہے اس میں ان کے تقریباً ۹۸/افسانے شامل ہیں جو مختلف عنوانات پر لکھے گئے ہیں۔

جہیز وہ بیماری ہے جو کہ ہمارے معاشرے کو دیمک کی طرح کھوکھلا کیے جارہی ہے، یہی وہ لعنت ہے جس کی وجہ سے والدین اپنی بیٹیوں کی شادی نہیں کر پاتے ہیں اور اگر وہ ان کی شادی کر بھی دیتے ہیں تو ان کو ان کے سسرال میں تکلیف دی جاتی ہے اور کبھی کبھی تو اس کو جلا کر مارنے کے واقعات بھی سامنے آتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج بھی بیٹیوں کو کوکھ میں ہی مار دیا جاتا ہے۔ ''خوابوں سے پرے'' اور ''نجات'' میں اسی لعنت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

ماں! میری شادی کب ہوگی؟

جب اس کو دینے کے لیے ہمارے پاس ٹی
وی ہوگا، اسکوٹر ہوگا، اور بہت سا بینک بیلنس ہوگا۔

غریبی وہ برائی ہے جو کہ ہمارے ملک کی ترقی کی راہ میں دیوار بن کر کھڑی ہے۔اس کے متعلق نذیر کے دو افسانے ''تنخواہ کا دن'' اور ''تیسرا آدمی'' اہمیت کے حامل ہیں۔

افسانہ ''تیسرا آدمی'' میں ایک ایسے آدمی کا المیہ پیش کیا گیا ہے جو کہ بھیک مانگ کر اپنی گزر بسر کرتا ہے لیکن نفرت کی آگ میں جل کر ہندوؤں نے مسجد کو اور مسلمانوں نے مندر کو توڑ دیا جس کے نتیجے میں وہ شخص وہاں پر بھیک مانگنے سے بھی محروم کر دیا گیا۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو زبان کے ساتھ جو ناانصافی کی گئی ہے اس کی گونج نذیر کے افسانوں میں صاف طور پر سنائی دیتی ہے، آزادی کے ملنے کے بعد اردو زبان کو در کنار کر دیا گیا جب کہ ملک کو آزادی دلانے میں اردو نے اہم رول ادا کیا ہے، ''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ اردو زبان ہی نے تمام ہندوستانیوں کو دیا تھا۔ ''خواب سے حقیقت تک'' اور ''لاوارث'' وہ افسانے ہیں جو کہ اسی طرف اشارہ کرتے ہیں، افسانہ لاوارث سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''بنگال میں بنگالی زبان پھولوں کی طرح مہک رہی
ہے، تامل ناڈو میں تمل ، کیرالا میں ملیالم ، راجستھان
میں مارواڑی زبان اپنے پورے وجود کے ساتھ زندہ ہے اور
ہندی کی تو بات ہی کیا ہے؟ یہ تو پورے بھارت ورش کی ناک
کا بال ہے مجمع میں سے کسی نے بلند آواز میں کہا اور اردو؟''

(ریزہ ریزہ دل، ص ۳۲)

فرخ صابری نذیر کے اس افسانوی مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں......

''نذیر فتح پوری کے یہاں پر موضوعاتی تنوع کا کینوس بے حد وسیع ہے کیونکہ بصارت اور بصیرت کے حامل یہ افسانچے متعدد جہات کے عکاس ہیں، گہری معنویت اور اجتماعی صورتحال کے سبب ''ریزہ ریزہ دل'' کے کئی افسانے اپنے عہد سے بلند ہوکر ہر عہد کے لیے بامعنی ہوگئے ہیں۔''

اس مجموعے میں نذیر نے کردار نگاری کا بھی خاص خیال رکھا ہے، اس لحاظ سے بھی یہ مجموعہ قابل ذکر ہے کہ نذیر نے اپنے افسانچے کے قصوں کو پیش کرنے میں جو کردار منتخب کیے ہیں ان کرداروں نے افسانوں کی روح کو قاری کے ذہن تک رسائی نہایت آسان کر دی ہے اور قاری کو سوچنے پر آمادہ کر دیا ہے پھر چاہے وہ ''میدان حشر'' کا خانہ داریوں کے بوجھ تلے دبا ہوا شخص ہو یا پھر ''خوابوں سے پرے'' کی ماں بیٹی یا پھر ''انجام کار'' کا بستر پر ایڑیاں رگڑتا ہوا بیمار شخص یہ سبھی قاری کے ذہن پر اپنا عکس چھوڑ جاتے ہیں۔

مراق مرزا اس مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں......

''یہ افسانے اپنے قارئین کو زندگی کے ایک بولتے ہوئے دلکش میوزیم کی سیر کراتے ہیں جہاں پر فریب، مکر، زمانہ ساز اور موقعہ پرستی کی زہریلی ہوا بھی ہے اور خلوص و محبت شرافت اور انسانیت کی زندگی سے بھرپور صدا بھی جہاں

انسانی تہذیب اور کردار کے گرتے ہوئے معیار کی سسکتی
ہوئی کہانی بھی ہے اور پرانی روایت کے مقابر پر بجھی ہوئی
قندیل کی نشانی بھی جہاں سمندر کی موجوں کا شور اور صحراؤں
کا سکوت بھی ، یہ افسانے ہمیں زندگی کے ان کرداروں سے
روشناس کراتے ہیں جنہیں ہم اپنے گرد و نواح میں روز ہی
دیکھتے ہیں مگر اپنے شعور کے طاقچوں پر کبھی سجاتے نہیں۔''

(نذیر فتح پوری ریگستان سے نخلستان تک، ص ۱۴۳ ۲)

ایک افسانے کی کامیابی کا دارو مدار ایک حد تک اس کی مکالمہ نگاری پر منحصر ہوتا ہے، نذیر بھی اس بات سے بخوبی واقف ہیں اسی لیے اپنے قلم کے جادو سے بہت مخصوص انداز میں انہوں نے مکالمے تحریر کیے ہیں ان افسانچوں میں انہوں نے بہت ہی مختصر مکالموں کے ذریعے قصے کو قارئین کی نذر کر دیا ہے اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں وہ بڑی بڑی نصیحت کر گئے ہیں، ان کی مکالمہ نگاری کا انداز ملاحظہ ہو ......

امیر کی بیٹی نے گھر بلا کر غریب کے بیٹے سے کہا
میں تم سے پیار کرتی ہوں کیا تم مجھ سے شادی کرو گے؟
غریب کے بیٹے نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا
تمہیں جہیز میں دینے کے لیے میرے پاس جوانی نہیں ہے
کہاں گئی تمہاری جوانی؟
تم جیسی ہی امیر زادی نے اسے پہلے ہی خرید رکھا ہے

(ریزہ ریزہ دل، ص ٦٧)

منظر نگاری کے اعتبار سے بھی نذیر کے افسانے مکمل نظر آتے ہیں، انھوں نے بہت کم الفاظ میں اپنی بات کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ منظر اور ماحول مکمل طور پر ابھر کر قاری کے سامنے پیش ہو جاتے ہیں اور پورا پس منظر قاری کے ذہن میں گردش کرنے لگتا ہے۔ اس ضمن میں افسانچہ ''نیندوں سے پرے'' کا یہ منظر ملاحظہ ہو......

میں اپنے محل میں فانوس روشن کر کے یہ بھول گیا تھا
کہ میرے پڑوس کے جھونپڑے میں دیا بھی نہیں ہے

(ریزہ ریزہ دل، ص ۸۰)

سیرت نگاری کے اعتبار سے بھی اس مجموعے کے افسانے قارئین کے سامنے بہترین مثال پیش کرتے ہیں نذیر نے یہاں بھی اپنے قلم کا جادو جگایا ہے اور سیرت نگاری کے بہترین مرقع پیش کیے ہیں اس کی مثال مندرجہ ذیل ہے۔

''ماں کی کہانی بھی کچھ عجیب ہے میں نے اس کی کوکھ
سے جنم لیا تھا وہ تب بھی ماں تھی اس کے بعد میرے بچے نے
جنم لیا وہ تب بھی ماں تھی اور آج میرے بچے کے گھر میں
جب ایک بچے نے جنم لیا وہ تب بھی ماں ہی ہے ''یعنی ماں''

(ریزہ ریزہ دل، ص ۹۹)

نذیر کے اس مجموعے پر اپنی رائے بیان کرتے ہوئے جناب وصیل خاں لکھتے ہیں......

''نذیر فتح پوری چونکہ زمین سے جڑے ہیں اس لیے
ان کے یہاں پر تصنع اور بناوٹ سے گریز صاف دکھائی دیتا
ہے معاشرے اور سماجی مدو جزر کا انھوں نے بہت قریب سے

مشاہدہ کیا ہے۔“

زیر تبصرہ کتاب ”ریزہ ریزہ دل“ کے بیشتر افسانے موثر مکمل اور ترسیل میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ پرانی بات، ایسا بھی ہوتا ہے، تعاقب، وعدہ، آئینہ، تنخواہ کا دن، بہروپ، تیسری آنکھ اور زندگی ایک لطیفہ، ان کے ایسے منی افسانے ہیں جن سے لہو میں حدت پیدا ہوتی ہے اور ذہن و دل کے کئی دریچے کھلنے لگتے ہیں۔

(روزنامہ اردو ٹائمز ممبئی ۱۱/ جون ۲۰۰۶ء)

ان ساری خوبیوں کے باوجود کچھ کمیاں بھی اس مجموعے میں محسوس ہوتی ہیں جیسے کہ افسانچے، فنکار کا دل، اور تم کو دیکھوں کہ تم سے بات کروں میں ان کا مخاطب کون ہے؟

بہر حال مجموعی طور پر ان کا افسانہ ریزہ ریزہ دل اردو افسانوی تاریخ میں ایک اضافہ ہے اور منی افسانے کے سرمایہ میں اہمیت کا حامل ہے۔

****

نذیر فتح پوری کا ’ریزہ ریزہ دل‘

ڈاکٹر مجید احمد آزاد

نذیر فتح پوری کی ۲۷ ویں کتاب ’’ریزہ ریزہ دل‘‘ میرے سامنے ہے۔نذیر فتح پوری کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ اوبی صحافت میں ’’اسباق‘‘ پونہ کے ذریعہ انہوں نے شعر وادب کی ایک کہکشاں آباد کر رکھی ہے۔ اچھے شاعر تو ہیں ہی عمدہ نثر نگاری کی روایت کی توسیع میں وہ برابر سے شریک ہیں۔ ان کی شخصیت اور فنکاری پر کتابیں آچکی ہیں۔ کئی یونیورسٹیوں میں ان پر تحقیقی مقالہ لکھا جارہا ہے۔ مذکورہ باتیں کسی بھی ادیب کی شناخت کے لیے کم نہیں ہیں۔

’’ریزہ ریزہ دل‘‘۔ ان کے منی افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں چھوٹے بڑے کل ۹۸ منی افسانے شامل ہیں۔ منی افسانے کی روایت پر اس صنف کو فروغ دینے والے فنکاروں کا ماننا ہے کہ اس کا رشتہ ’’سیاہ حاشیے‘‘ (سعادت حسن منٹو) سے ہے۔ اس تحقیق وتنقید سے قطع نظر نذیر فتح پوری کے منی افسانے کا مطالعہ زندگی کی ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی یاد دہانی کراتا ہے۔ جن کے اثرات ذہن ودل پر دیر تک مرتسم رہتے ہیں۔ اس مجموعہ کے تین چار سطری منی افسانے میدان حشر، عکس برعکس، تجربے کے بعد، پذیرائی، سوداگر، یہ بھی آگ ہے، انجام، ہنس کی چال، خوش فہمی، ترقی کا انجام کار، وغیرہ ہیں۔ ایک منی افسانہ ’’انجام کار‘‘ ملاحظہ کیجیے اور اس صنف کے خدوخال کو محسوس کیجیے:

’’اور پھر یوں ہوا/ دوسروں کو مٹانے کی فکر میں/ وہ خود ہی مٹ گیا۔‘‘

اس مجموعے کی طویل منی کہانیاں جن کی ضخامت دو صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں ’’کوئی عنوان نہیں‘‘، ’’بابا کی دعا‘‘، ’’طوفان کے بعد‘‘، ’’نیند سے پرے‘‘ وغیرہ پر اثر

ہیں میں بلاخوفِ تردید مذکور طویل منی کہانیوں کو افسانہ مانتا ہوں کہ ان میں افسانے کے تمام فنی لوازمات موجود ہیں۔ ایک صفحات پر پھیلے ہوئے بیشتر منی افسانے پڑھتے ہوئے مصنف کے تجربات کی داد دینی پڑی۔ اس مجموعہ کے منی افسانے سے قبل ڈاکٹر عظیم راہی نے عرض مرتب کی حیثیت سے مصنف اور ان کی اس کاوش کو صنف منی افسانہ کے لیے نیک فال مانا ہے۔ حرف اول کے طور پر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کی تحریر جامع اور سود مند ہے۔ انہوں نے نذیر فتح پوری کی خوبیوں کو اجالتے ہوئے ان کی تخلیقات کا جائزہ لیا ہے۔ اعتراف کے عنوان سے مصنف نے اپنی نثری خدمات کا تعارف پیش کیا ہے۔ اس سے موصوف کی ہمہ جہت شخصیت کا علم ہوتا ہے اس کتاب کے آخری تین صفحات پر مصنف کی تصانیف، غیر مطبوعہ مسودے اور ان کے فکر وفن پر ترتیب دی گئی کتابوں کی فہرست جمع کی گئی ہے۔ کل ملا کر نذیر فتح پوری کی یہ کتاب نئی اصناف کو دلچسپی سے پڑھنے والے اور کہانی پسند قارئین کو ضرور پسند آئے گی۔

(سہ ماہی تمثیل نو۔ دربھنگہ، جلد ۱۳۔ شمارہ ۲۷۔ جولائی ۲۰۱۳ سے جون ۲۰۱۴۔ صفحہ نمبر ۳۱۱)

****

نذیر فتح پوری کا رومانی ادب

آزاد دلدار ہاشمی، پونہ (مہاراشٹر)

اس حقیقت سے انکار نہیں کہ اردو شعر و ادب پر عرصۂ دراز تک عشق و محبت کا طلم چھایا رہا۔ مثال کے طور پر متقدمین شعراء کی بے شمار غزلیں اور تذکرۂ عشق و محبت سے لبریز سینکڑوں داستانیں پیش کی جاسکتی ہیں دراصل اردو کے رومانی ادب کی تخلیق عام طور سے ان شعراء اور ادباء کی رہینِ منت ہے، جو بذاتِ خود رومانی فطرت لے کر پیدا ہوئے تھے اور عشق کی راہ پر چلتے ہوئے ٹھوکریں کھائی تھیں سینے میں ہمیشہ رسنے والے زخموں کی لذتوں کو محسوس کر کے انہیں الفاظ میں سمو دیا تھا اور اپنی جمالیاتی حس کو قوتِ گویائی دے کر دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔

عشق، خواہ حقیقی ہو یا مجازی، جب تک خون بن کر فنکار کی رگوں میں نہیں دوڑتا تب تک شعر و ادب کے چہرے پر سرخی اور شگفتگی نہیں آتی۔ عشق اگر عوام الناس کے لیے امر لازم ہے تو فنکار کے لیے فرضِ اولین کی حیثیت رکھتا ہے۔ سچا اور پاکیزہ عشق اپنے اندر آسمانوں کی بلندی، ستاروں کی ضیا، دھرتی کا تقدس اور دریا کی گہرائی رکھتا ہے، عشق ہی وہ جذبہ ہے جو کبھی غالب جیسے فطری اور آفاقی شاعر کو نکما بناتا ہے۔ تو کبھی میر، سودا اور مومن جیسے جیالے اور دیدہ ور شعرا کو سوختہ تن اور سوختہ جان بھی بناتا ہے۔ اور یہی عشق داغ جیسے متین ذہن اور بارعب شخصیت کے مالک شاعر کو شرارت اور شوخی پر آمادہ کرتا ہے۔

شاعروں، ادیبوں اور فنون لطیفہ سے شغف رکھنے والے دیگر مشاہرین کی زندگیوں میں جھانک کر دیکھا جائے تو ان کی فنکارانہ چابک دستی اور تخلیقی دردمندی

کے پس منظر میں ایک عدد رومانی داستان ضرور ملے گی۔ اگر مہا کوی کالی داس کا دل عشق کے پاکیزہ جذبات سے مملو نہ ہوتا تو دنیا کو "شکنتلا" جیسا رومانی اور لافانی کردار کبھی نہیں ملتا۔ اگر مغل بادشاہ شاہجہاں رومان پرور اور وفا پرست نہ ہوتے تو تاج محل جیسا شاہکار روئے زمین کی زیبائش کبھی نہیں بنتا۔

رومان قدرت کی طرف سے ایک عطیہ ہے۔ جو ہر کس و ناکس کو نہیں ملتا اور جسے قسمت سے مل جاتا ہے اسے نہال کر دیتا ہے۔

رومان کے لیے کسی حقیقی یا خیالی وجود کا ہونا لازمی ہے۔ کسی اسم خاص سے فنکار کی والہانہ انسیت بھی بے حد ضروری ہے۔ ہر فنکار کا اپنا ایک آئیڈل بھی ہوتا ہے۔ جس سے اس کی جذباتی اور رومانی وابستگی اسے اس منزل پر لے جاتی ہے۔ جہاں اس کے جذبات واحساسات الفاظ کے حسین پیکر میں ڈھل کر رومانی ادب کی تخلیق کرتے ہیں، مثال کے طور پر اختر شیرانی کی سلمیٰ کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔ جس سے ان کی جذباتی وابستگی نے اردو شاعری کے دامن کو بہترین اور دلکش رومانی شاعری سے مالا مال کیا اور اختر شیرانی کو رومانی شاعری کا بے تاج بادشاہ بنا دیا، اگر چہ اختر کی رومانی شاعری میں سلمیٰ کے علاوہ بھی کئی نام ملتے ہیں جنہوں نے اختر کی جمالیاتی قدروں کی تکمیل کی۔ لیکن ان سب میں سلمیٰ کا نام سر فہرست بھی ہے۔ اور اہمیت کا حامل بھی۔

اختر شیرانی کے بعد جگر مرادآبادی، مجاز لکھنوی، جاں نثار اختر اور ساحر لدھیانوی مرحوم نے بھی رومانی مملکت پر مدتوں حکومت کی اور اپنے نقشِ جاوداں چھوڑے۔ جو مٹائے نہیں مٹتے۔ ساحر کو تو رومان کے نام پر جتنی تلخیاں ملیں من وعن انہوں نے دنیا کے سامنے انڈیل دیں۔

آج جدید شاعری کے دور میں بھی رومانی شاعروں اور ادیبوں کا فقدان نہیں

ہے۔لیکن رومانیت کے نام سے مشہور و مقبول ہونے والے چند ہی قلمکار ہیں۔جن میں ایک معروف نام نذیر فتحپوری کا بھی ہے۔

نذیر فتح پوری کی تخلیقات کے مطالعہ کے دوران جب میری نظر ''شبانہ'' پر پڑی تو میں چونک گیا، اور ان کی رومانی تخلیقات کی تحقیق کے شوق نے میرے جذبۂ تجسس کی پلکوں کو سہلایا۔ میں نے آنکھیں مل کر جب نذیر فتحپوری کی تصنیف ''زخم اور آہیں'' پر نظر دوڑائی تو ''حرفِ اول'' میں ان کے آئیڈیل ''شبانہ'' کی وضاحت خود ان کے قلم سے سنی۔

''شبانہ'' میرا آئیڈیل ہے اس نام سے مجھے ہمیشہ محبت رہی ہے۔میرے پہلے افسانے کی ہیروئن کا نام بھی ''شبانہ'' ہی تھا۔''زخم اور آہیں'' کے اس کردار کو میں نے دل کی گہرائیوں سے تخلیق کیا ہے۔(ناول ''زخم اور آہیں'')

گذشتہ سال پونہ کے اسٹیج پر نذیر فتحپوری کا قلمبند کیا ہوا ایک رومانی ڈرامہ ''زینت محل'' پیش کیا گیا تھا۔اس ڈرامے کی کہانی نواب وضاحت حسین کی اکلوتی نورِ نظر ''شبانہ'' اور مشہور زمانہ شاعر آفتاب عالم آفتاب کی بے پناہ محبت کے تناظر میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔دونوں کی محبت کا راز فاش ہو جانے کے بعد نواب وضاحت حسین اور آفتاب کے مابین جو مکالماتی معرکہ ہوتا ہے اس وقت یوں لگتا ہے جیسے آفتاب کے مکالموں میں نذیر نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہو۔

نواب صاحب (بیٹی سے) جاؤ شبانہ! یہ وفادار تمہیں بلا رہا ہے۔یہ خود بے سہارا ہے لیکن نواب وضاحت حسین کی اکلوتی بیٹی کو ضرور سہارا دے گا۔

آفتاب (شبانہ سے) ''ہاں شبانہ! جب تک میری زندگی سلامت ہے جب تک میرا دل اور ضمیر زندہ ہے میں تمہیں سہارا دوں گا۔چلو شبانہ! محبت کی راہیں تمہارے قدموں کی منتظر ہیں (ڈرامہ ''زینت محل'')

۱۹۷۹ء تک خاتونِ مشرق دہلی اور ماہنامہ گل کدہ سہسوان میں نذیر فتحپوری کی

نظمیں، غزلیں اور افسانے بعنوان ''شبانہ کے نام'' قسط وار شائع ہوتے رہے ہیں۔ خالص رومانی طرز کے اس سلسلے کو قارئین نے بے حد پسند کیا تھا۔ جس کی پسندیدگی اور مقبولیت کا اندازہ ''گل کدہ'' جنوری ۱۹۷۸ء کے صفحہ نمبر ۲۲ پر شائع شدہ نذیر ہی کے ایک خط سے لگایا جا سکتا ہے جو مدیر اعلیٰ جلیس سہسوانی کے نام ہے۔

''برادرم جلیس صاحب! شبانہ کے نام خطوط پر مبنی اس سلسلے کو مقبولیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ بصورتِ نظریہ سلسلہ خاتونِ مشرق میں بھی گذشتہ چھ ماہ سے جاری ہے اور کافی پسند کیا جا رہا ہے۔

نذیر فتحپوری کی اس بات کی تصدیق کے لیے قارئین کے چند خطوط پیش کرتا ہوں۔ پہلا خط مس فیروزہ پروین کا ہے۔

''مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے نذیر صاحب کی نظم ''شبانہ کے نام'' کے اس بند نے۔''

میں نے چاہا ہے زمانے سے زیادہ تجھ کو
میرے دل میں تری چاہت کے سوا کچھ بھی نہیں
آخری دم بھی ترا نام رہے گا لب پر
میری سانسوں میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں

نذیر صاحب کی اس نظم سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ان کے جذبات کی عکاسی کر رہی ہو۔ اس سے پہلے بھی نذیر صاحب کے چند افسانے اور غزلیں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اُن کی تحریروں میں جو درد و کرب ہے وہ روح کی گہرائیوں میں اترتا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن اس نظم میں نذیر صاحب نے شبانہ صاحبہ سے جو عہد کیا ہے اس کے پیش نظر تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان کی آئندہ غزلوں میں ان کی روح کا کرب مسرتوں کی آغوش میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سمٹ جائے گا۔

(خاتونِ مشرق، فروری ۱۹۷۸ء)

دوسرا خط قدیر محمد ہاشمی کا ہے۔ نذیر صاحب کا خطوط پر مبنی افسانہ ''شبانہ کے نام'' بے حد پسند آیا۔ اُسے پڑھ کر مجھے اپنی کہانی یاد آ گئی۔ سچ ہے دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ (گل کدہ) گل کدہ ہی کے کسی شمارہ میں راقم الحروف کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ ''شبانہ کے نام'' کا تیسرا حصہ خوبصورت ہے۔ اختر شیرانی کی سلمٰی کے بعد نذیر فتحپوری کی ''شبانہ'' ادب اور رومان کی دنیا میں شدید پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ اس سلسلے کو جاری رکھیے۔ (گل کدہ)

''شبانہ کے نام'' نذیر کے فن پاروں نے خصوصاً صنفِ نازک کو بہت متاثر کیا۔ نذیر کے نام چھپے اور براہِ راست دستیاب ہونے والے مکتوب کی فہرست میں زیادہ تر نام لڑکیوں ہی کے ملتے ہیں۔ کوئی مس فریدہ ہے تو کوئی مس ترنم، کسی کا نام اختر جہاں ہے تو کوئی اشرف جہاں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ خطرناک اور چونکا دینے والا ایک مکتوب پیش کرتا ہوں۔ یہ خط ایک ایسی محترمہ کا ہے جو دہلی کے کسی اسکول میں معلمہ ہیں۔ اخلاقاً ان کے نام کو صیغۂ راز میں رکھتے ہوئے خط کا اقتباس پیش کرتا ہوں ملاحظہ فرمائیں۔

مسٹر نذیر فتحپوری کے نام

ایک طویل عرصے سے میں آپ کے افسانے، مضامین اور غزلیں پڑھتی چلی آ رہی ہوں۔ کتنی دلچسپی سے پڑھتی ہوں اس کا کسی کو کیا علم، آپ سے ایک بات دریافت کرنا چاہتی ہوں کہ شبانہ صاحبہ کون ہیں؟ ویسے یہ کہانی فرضی بھی ہو سکتی ہے۔ اگر حقیقت ہے تو بڑے رنج والم کی بات ہے۔ حال ہی میں آپ کا لکھا ہوا افسانہ ''التجائے درد دل'' میری نظر سے گزرا، جس کا ہر لفظ درد میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور ہر طرح شبانہ سے التجا کر رہی تھی۔ غزل کا بھی ہر شعر اپنی بے بسی پر آنسو بہا رہا تھا۔ پڑھتے

پڑھتے میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ خدا جانے دنیا میں کیسے کیسے بے درد لوگ موجود ہیں۔ برا نہ مانیے۔ آپ کی غزل ''شبانہ کے نام'' پڑھ کر خاموش نہیں رہا گیا اور آپ سے ''یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ آخر اس درد کی دوا کا ہے۔'' معلوم کرنے بیٹھ گئی۔

آپ کے افسانوں میں بلا کا جادو ہے۔ حسن ہے، درد ہے، آپ کے قلم میں بے پایاں جان ہے نذیر صاحب! اگر آپ اسی طرح افسانے اور غزلیں لکھتے رہیں تو آپ کی شبانہ ضرور دیوانی ہو جائے گی، نذیر صاحب! کیا واقعی آپ کی شبانہ اسی پریشانی میں مبتلا ہے جو آپ نے بیان کی ہے؟ آپ اپنے افسانوں میں اتنا درد کس طرح سموتے ہیں۔ کیا واقعی محبت میں ایسا ہوتا ہے۔ جیسا آپ کے افسانوں میں ہوتا ہے؟ آپ کے افسانوں سے نہ معلوم کتنی ہی شباناؤں کا بھلا ہوتا ہوگا۔ اور آپ کے افسانے آپ کی شبانہ کے زخموں کا مرہم بن جاتے ہوں گے۔

(صفحہ نمبر ۱۱، خاتونِ مشرق، شمارہ جولائی ۱۹۷۸ء)

یہ اور اس قسم کے بے شمار خطوط پڑھنے کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سی کہانی ہے جس نے لوگوں کو اس قدر متاثر کیا کہ پڑھنے والے اسے اپنی ہی روداد اور اپنے ہی دل کی بات سمجھ کر تڑپنے اور آہ بھرنے کے لیے مجبور ہو گئے؟

میں نے نذیر صاحب کی تخلیقات کے پس منظر میں جس کہانی کا چہرہ دیکھا ہے اس نے مجھے اس نتیجے پر پہنچایا ہے کہ ''شبانہ'' قسمت کی ماری اور حالات کی ستائی ایک نو عمر اور نوخیز کلی ہے۔ جسے کھلنے سے پہلے ہی ''دستورِ چمن'' کے مطابق باغبان نے ازدواجی زندگی کے بندھنوں میں باندھ کر ایک ایسے شخص کے دامن میں پھینک دیا ہے جس کے متعلق اس نے سوچا تک نہیں کہ وہ دامن اس حساس اور جذباتی کلی کے شایانِ شان ہے یا نہیں؟ وہ اس کے جذبات کی پذیرائی کر سکتا ہے یا نہیں؟ وہ اسے زمانے کی زہریلی اور خزاں آلودہ ہواؤں سے محفوظ رکھ سکتا ہے یا نہیں؟ یہ کلی خاندانی رسم و رواج

کے مطابق ایک روایتی بیوی بن کر اس کے دامن میں خلوص کے ساتھ سمٹ جاتی ہے اور اسے اپنے شباب کی خوشبو اور تازگی سے بھر دیتی ہے۔ دونوں کے ملن سے ان کے دامن میں ایک معصوم غنچہ کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ زندگی کھل اٹھتی ہے۔ لیکن وہ کلی جب تنہائی میں سوچتی ہے تو اُسے اپنی زندگی میں ایک خلا دکھائی دیتا ہے۔ ایک ادھوری پیاس کا احساس اس کی روح کی تازگی اور چہرے کی دلکشی چھین لیتا ہے۔ بظاہر رنگ و نور اور نکہت میں ڈوبی اس معصوم کلی کی خوشیوں کا باغ اس وقت اجڑ جاتا ہے جب موت کے بھیانک اور نوکیلے کانٹے اس کے اس دامن کو تار تار کر دیتے ہیں۔ وہ سہاگن بن کر جی رہی تھی اور وقت سے پہلے اس کے سہاگ کی چنری تار تار ہو جاتی ہے اور اپنے معصوم غنچے کے ساتھ وہ خزاں میں گھر جاتی ہے تو اس حساس شاعر کا قلم ہمدردی سے لبریز اس عہد کی تخلیق کرتا ہے۔

تیری اجڑی ہوئی اس مانگ میں تارے بھر کر
عہد کرتا ہوں کہ دلہن میں بناؤ گا تجھے
اے مری زینت، مرا پیار، مرے دل کی پکار
اپنے ہی خون کی سرخی سے سجاؤں گا تجھے

نذیر فتحپوری کی اس نظم میں تشریح طلب کوئی بات نہیں ہے۔ سب کچھ کھل کر بیان کیا گیا ہے۔ اب آیئے ان افسانوں کے اقتباسات بھی پڑھتے چلیں جو ٹوٹے خواب اور اجڑے جذبات کی ایک الم انگیز داستان اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

''جانِ نذیر شبانہ! تمہارا خط ملا۔ تم نے لکھا کہ ''کبھی کبھی میرے دل میں آتا ہے کہ میں خود کشی کر لوں۔ ایسی دنیا میں زندہ رہ کر کیا فائدہ جہاں آدمی کی سانسیں گنی جاتی ہوں، جہاں قدم قدم پر بندشیں ہوں، زنجیریں ہوں، جہاں جذبات پر پہرہ اور زبان پر تالے لگا دیے گئے ہوں۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ایسی ذلت کی زندگی سے موت

بہتر ہے یا نہیں؟ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں گھر جانے کے بعد ایک قسمت کی ماری مظلوم جوان بیوہ موت کی تمنا نہیں کرے گی تو کیا کرے گی۔ مگر میں جب بھی موت کے بارے میں سوچتی ہوں تو جانے وہ کون سی طاقت ہے جو غائبانہ طور پر مجھے زندگی کا احساس دلاتی ہے اور مجھے زندہ رہنے پر مجبور کرتی ہے۔''

یہ تھا شبانہ کے خط کا اقتباس جس کے ہر لفظ میں درد کی داستاں چھپی ہوئی ہے۔ جس کی ہر سطر میں ایک بے بس اور مجبور آتما کی فریاد پوشیدہ ہے۔ اب آپ اس خط کا جواب بھی ملاحظہ کرلیں۔

''تمہارا خط پڑھ کر افسوس کی ایک لہر میرے دل میں دوڑ گئی۔ اس قدر مایوس اور دل برداشتہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ مشکلیں تو زندگی کا دوسرا نام ہے۔ زندہ رہنے کے لیے لوگوں کو نہ جانے کیسے کیسے دکھ برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ اپنی زندگی کے اس خلا کو تم اپنے ہاتھوں سے پُر کرسکتی ہو۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ تمہارے گھر والے تمہاری اجڑی ہوئی مانگ میں تارے بھرنے کا اہتمام کریں گے تو یہ خیال خام ہے۔ یہ لوگ تمہاری خوشی کی خاطر تمہیں ازسرنو سہاگ کا جوڑا پہنانے پر رضا مند ہو جائیں گے۔ میں کہتا ہوں ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ جن لوگوں نے سونے کی قینچی سے تمہارے پَر کاٹ کر تمہیں چاندی کے پنجرے میں قید کر رکھا ہے وہ بھلا آسانی سے تمہیں اڑ جانے کی اجازت کیسے دیں گے۔ ہاں اگر تم میں حوصلہ ہے تو اپنے پروں میں اُڑنے کی طاقت پیدا کرو۔ توڑ دو چاندی کے اس بے جان پنجرے کو اور دنیا سے بغاوت کا اعلان کردو۔ سماج اور خاندان کی مردہ رسم وروایت کو ٹھوکر ماردو، کیونکہ زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔ زندگی اس کے قدم چومتی ہے جو جوان حوصلوں کے ساتھ منزل کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔''

اگر تمام افسانوں کے اقتباسات نقل کیے جائیں تو مضمون طوالت کا شکار ہو

جائے گا۔ ''اس لیے مجھے یہ عرض کرنے دیجیے کہ ''شبانہ کے نام'' سلسلہ وار لکھ کر نذیر فتحپوری نے شبانہ کے کردار کو حقیقی رنگ دیا ہے۔ اور قارئین نے شبانہ کے وجود کو تسلیم کر کے اس سے ہمدردی کا اظہار بھی کیا ہے۔ خصوصاً خواتین کے وہ بے شمار خطوط جو نذیر کی فائل میں بند ہیں ان کے مطالعہ سے اس بات کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ دراصل؛ نذیر کے رومانی ادب میں ''شبانہ'' کے کردار نے ایک تہلکہ مچا دیا ہے۔ نذیر نے شبانہ کے ارد گرد رومان کے جو خوشنما پھول سجا رکھے ہیں ان کی خوشبو سے نذیر کا رومانی ادب مہک اٹھا ہے اور ہزاروں مظلوم شبانائیں نذیر کے افسانوں اور غزلوں میں اپنے اپنے جذبات واحساسات کی خوشبو محسوس کرتی ہیں اور اس سے زندگی کا حوصلہ پاتی ہیں۔ نذیر کی ایک غیر مطبوعہ غزل جو اپنے اندر ایک ہی قسم کا تاثر لیے ہوئے ہے یہ غزل جو شبانہ کے نام ہے اس کے ہر شعر سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ نذیر آج بھی شبانہ کو بھول نہیں پائے ہیں اور ان کے اندر کا رومانی شاعر آج بھی بیتے دنوں کو یاد کرتا ہے۔

****

نذیر فتح پوری کا شعرائے پونہ۔ ایک تحقیق

انیس چشتی

میں نے شاعری کبھی نہیں کی، لیکن پاؤ صدی سے زیادہ مختلف سطحوں پر ادب پڑھایا ہے۔ شعر کی کسک اور دھمک دونوں نے میرے دل پر چوٹ کی ہے۔ اچھا شعر مجھے آج بھی تڑپاتا ہے اور یاد ہو جاتا ہے۔ علمی کاموں کے دوران، طالب علمی کے زمانے کی پڑھی ہوئی تاریخ ادب اردو کام نہیں آتی اس لیے مجھے اپنے علم کو تازہ رکھنے کی علت ہے۔ میرے خاندان میں ہمیشہ سے شعر وادب کا چرچا رہا ہے۔ میں نے اپنی ابتدائی عمر میں کئی درجن مشاعروں کی نظامت کی ہے۔ غیر شاعر ہوتے ہوئے بھی ارباب نے مجھے بعض مرتبہ مشاعروں کا صدر نامزد کیا ہے۔ پونہ میں بھی اور باہر بھی۔ شعر وادب کے فروغ کے لیے ایک باقاعدہ انجمن بنائی تھی اور لٹل فلاور اسکول کے پرنسپل سے کہہ سن کر ان کا ہال ہر ہفتے ایک مشاعرے کے لیے مانگ لیا تھا۔ دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ میں مظہر امام، قاضی سلیم، بلقیس ظفیر الحسن وغیرہ کے نام کئی شاموں کا باقاعدہ اہتمام کیا تھا۔ مظہر امام جب پونہ میں زیر تربیت تھے تو کورس کے اختتام پر کشمیر روانہ ہونے سے پہلے ایک ہفتہ کے لیے وہ باقاعدہ میرے غریب خانے پر ہی اٹھ آئے تھے اور اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ جاتے وقت مجھے بھی اپنے ساتھ کشمیر لے گئے۔ شاذ تمکنت کے اعزاز میں راقم نے ایک باقاعدہ مشاعرہ کیا۔ پروفیسر دستگیر شہاب، بشیر انصاری، افتخار احمد فخر دھولیوی، عکسی برنی، زاہد کمال، فطرت سرمدی، رخ زماں انصاری، دلدار ہاشمی، نذیر فتحپوری، حکیم رازی، ظفر احمد۔ میجر ظفیر الحسن، حنیف ساغر، فلک

رومان، ارمان اختر، یہاں تک کہ شوق پونوی، زیڈ عابد، یونس مظفرنگری، سلام فردوسی، رشید اعجاز اور اکثر ڈاکٹر عصمت جاوید مرحوم کا میرے ہاں اس قدر آنا جانا لگا رہتا اور ان بزرگوں اور احباب سے ایسی جذباتی اور فکری ہم آہنگی تھی کہ شہر بھر کے لوگ اور بطورِ خاص غیر مسلم احباب مجھے آج بھی شاعر سمجھتے ہیں۔ سلیم چشتی پونوی سے میرے والد کے دیرینہ بلکہ مخدومانہ روابط تھے۔ ہماری والدہ سے والد صاحب کا رشتہ سلیم چشتی پونوی کے ہی توسط سے طے پایا تھا۔ والد صاحب اپنی حیات بھر سلیم چشتی مرحوم کے نام اور کلام کا احترام کرتے رہے۔ ''ساغر و مینا'' الماری میں کلیاتِ اقبال اور دیوانِ غالب کے ساتھ رکھی رہتی تھی۔ کہنے کا مطلب یہ کہ شعرائے پونہ کی تذکرہ نویسی کا کام ہمارے ہی خاندان کے کسی فرد کو کرنا چاہیے تھا، لیکن یہیں پہنچ کر مجھے کہنا پڑتا ہے کہ ؎

مردے از غیب بروں آید و کارے بہ کند

نذیر فتحپوری پونہ والوں کے لیے عطیۂ خداوندی ہیں، ان کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے...... پونہ کے شعراء کے حالات جمع کرنے کا کام اگر نذیر فتحپوری نہیں کرتے تو شاید کوئی نہیں کرتا۔ اس کام میں کتنا جھکنا پڑتا ہے، نفسیات پر لگے کتنے کچوکے سہنے پڑتے ہیں، کتنا وقت اور پٹرول پھونکنا پڑتا ہے؟ اس کی تفصیل معلوم کرنی ہو تو کوئی صرف دس شاعروں کے حالات جمع کرکے دیکھ لیں۔

نذیر فتحپوری نے ابتدائی صفحات کے علاوہ پوری کتاب کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) مہمان شعراء

(۲) مرحوم شعراء

(۳) موجودہ شعراء

پہلا باب بڑی حد تک تشنہ ہے ہندوستان کا کون سا ایسا بڑا شاعر ہے جو

پونہ نہ آیا ہو اور جس نے پونہ میں منعقد ہونے والے کسی آل انڈا مشاعرے میں شرکت نہ کی ہو۔ بلکہ اکثر بڑے شعراء جب پونہ سے باہر ملتے ہیں تو یہ شکایت کرتے ہیں کہ ''آپ ہمیں پونہ نہیں بلاتے۔'' پونہ فیسٹیول میں شعراء کو مدعو کرنا آج کی رسم ہے لیکن پربھات اور شالیمار اسٹوڈیوز میں فلمی نغمہ نگاری اور مکالمہ نویسی کے چکر میں جوش ملیح آبادی سے لے کر تو ساحر لدھیانوی تک پونہ میں رہے ہیں۔ نوح ناوری بھی پونہ آچکے ہیں۔ قتیل شفائی کو تو چند برس پہلے ہی لوگوں نے دیکھا ہے۔ ہندوستان کے بہت کم شہروں کو نابغۂ روزگار شخصیتوں اور نادرۂ روزگار شاعروں کی پذیرائی اور میزبانی کا شرف حاصل ہوا ہے۔ عروس دکن پونہ اس سلسلے میں منفرد و کامیاب ہے۔ ساحر لدھیانوی متعدد بار پونہ آئے اور طویل قیام کیا۔ عامر عثمان صاحب کا انتقال نہرو میموریل ہال کے اسٹیج پر آل انڈیا مشاعرے میں اپنی جذباتی نظم ''ایمرجنسی'' سنانے کے فوراً بعد قلب کا دورہ پڑنے سے ہوا۔ ان کی لاش کو خود میں نے سہارا دے کر گاڑی میں رکھا ہے۔ جاں نثار اختر پونہ آچکے ہیں۔ ندا فاضلی، جاوید اختر، آج بھی پونہ آنے کے لیے کبھی انکار نہیں کرتے۔ پریم دار برٹنی، نریش کمار شاد بھی پونہ آتے رہے ہیں۔ کاش کہ ان میں چند کا تذکرہ آجاتا تو پونہ کی مہمان نوازی کو ایک سند مل جاتی۔ شاید طوالت کے خوف سے یہ جواہر ریزے کسی اور پاسنگ کے لیے اٹھا کر رکھ دیے گئے ہوں۔

کتاب کا دوسرا حصہ ''پونہ کے مرحوم شعراء'' پر مشتمل ہے۔ یہ حصہ بہت وقیع اور جاندار ہے اور ۳۰ شعراء کے حالات، زندگی پر مبنی ہے۔ اس حصے میں کالی داس گپتا رضا اور زیڈ عابد شہابی کی شمولیت نے چونکا دیا۔ ان دونوں افراد کے لیے پونہ حالانکہ گھر آنگن تھا لیکن نہ تو پونہ میں پیدا ہوئے اور نہ ہی یہاں وفات پائی۔ دونوں کی شہرت

ادب میں بالترتیب ممبئ اور بھیونڈی سے ہی رہی۔ تذکرے کے اس حصے میں اگر نجمی صاحب اور عروج قادری صاحب کا ذکر آجاتا تو بہتر تھا۔ نجمی صاحب ایک عرصے تک ''الہام'' نامی ماہنامہ بڑی کامیابی سے نکالتے رہے۔

اس تذکرے کا سب سے Risky اور ''جان کی امان پاؤں تو عرض کروں'' والا حصہ ''موجودہ شعراء'' کا ہے۔ اس حصے کو پڑھ لینے کے بعد اور اس کے ۵۵ر شعراء کے حالات سے گذر جانے کے بعد یہ بات سمجھ میں آئی کہ ہر کوئی تذکرہ لکھنے کی ہمت کیوں نہیں کرتا۔ معاصرانہ چشمک ایک چیز ہوتی ہے لیکن ''ہم عصری'' بالکل ایک الگ کیفیت کا نام ہے۔ جدید ٹکنالوجی کے دور میں ''فکر'' موسموں کی طرح بدلتی اور ''تفکرات'' سایوں کی طرح گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔ ان تمام پیرایوں کا اثر تعلقات پر پڑتا رہتا ہے۔ یہ نذیر فتحپوری کی گرم اور نرم ریتلی زمین کا ہی خاصہ ہے کہ اس نے پانی کے ساتھ ساتھ ہلاہل کو بھی جذب کرلیا اور کہیں یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ کون سی شخصیت، کس خیمے کی ہے۔ سب کا مونس، سب کا رفیق، سب کا یکساں قدرداں۔

غالب کو شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا تھا۔ نذیر کو شعروں کے انتخاب نے افزاء کیا ہے۔ چونکہ وہ خود شاعر ہیں اور معروف شاعر ہیں اس لیے ان کا مزاج شعر کی روح کو پہچان لیتا ہے۔ کس شعر اور شاعر کو کتنا قریب کیا جائے یہ فن انھوں نے ماہنامہ ''اسباق'' کی ادارت سے سیکھا ہے۔ کتاب کا یہ حصہ تازہ بھی ہے اور نو بہ نو بھی۔ اساطیری فکر سے لے کر عصری مزاج تک سمجھنے کے لیے اس حصے کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اس میں کوئی شاعر کشکول لیے نہیں کھڑا ہے بلکہ یوں لگتا ہے کہ اس نے اردو کو اپنے حصے کا خراج بھی واپس لوٹا دیا ہے۔ اتنے سارے نام، تصاویر اور اشعار دیکھ کر جذبۂ شکر سے بے اختیار آنکھیں ڈبڈبا گئیں کہ اللہ

نے میرے شہر کو کس قدر مالا مال کیا ہے۔ شہر کی روشن شاہراہوں پر کتنے گوشے ایسے ہیں جنھیں ہم دیکھ کر بھی ڈھونڈ نہیں پاتے۔ نذیر فتحپوری نے یہ تذکرہ لکھ کر نقابِ حسن کے سارے بند کھول ڈالے ہیں۔ نذیر کی نیم باز آنکھوں سے اگر کوئی شاعر بچ نکلا ہو تو اس کی ذمہ داری سبھوں نے اپنے سر لینی چاہیے، کیونکہ تحقیق کا کام کبھی مکمل نہیں ہوتا۔

اس کتاب کو جلد از جلد چھپ کر شائقین کے ہاتھوں میں پہنچنا چاہیے۔ اللہ سب کو سلامت رکھے اور عمر طویل عطا فرمائے۔ لیکن عمر جاوداں حاصل کرنے کے لیے مرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کتاب چھپنے میں دیر لگ جائے اور کتاب کی ترتیب بدلنے کی ضرورت پیش آجائے۔ میں نے بھی اس تذکرے پر تقریظ لکھنے کا نذیری حکم اس لیے مانا کہ یہ نثری کاوش ہے اور تحقیق و تدوین میرے مزاج سے مناسبت رکھتی ہے۔

انیس چشتی

پونہ: سنیچر ۳ ذی القعدہ ۱۴۲۴ھ بمطابق ۲۷ دسمبر ۲۰۰۳ء

****

''شعرائے پونہ-ایک تحقیق'' پر ایک نظر

ڈاکٹر پریمی رومانی

نذیر فتح پوری مالک و مدیرِ ''اسباق'' پونہ کے طور پر جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ لیکن وہ ایک قابلِ قدر شاعر بھی ہیں اور محقق و نقاد بھی، اُن کی دو درجن سے زائد تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں ناول بھی ہے اور شعری مجموعے بھی، افسانے بھی ہیں اور تنقیدی و تحقیقی مقالات بھی، انہوں نے مختلف مشاہیر ادب کی شخصیت اور فن پر بعض عمدہ کتابیں بھی ترتیب دی ہیں اور ادبی تاریخ اور تذکروں کے بعض اہم گوشوں کو بھی انہوں نے کتابی صورت میں منصۂ شہود پر لایا ہے۔ لیکن اُن کی اصلی پہچان اُردو کے ایک معتبر صحافی اور حساس اور دردمند شاعر کے طور پر پوری ادبی دنیا نے تسلیم کی ہے۔

''شعرائے پونہ-ایک تحقیق'' نذیر فتح پوری کا ایک تازہ ترین علمی و ادبی کارنامہ ہے۔ جو اردو علمی و ادبی حلقوں میں بے حد سراہا گیا ہے۔ حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ پونہ جناب منور پیر بھائی اس کتاب کے سرنامے میں نذیر فتحپوری کی فنی صلاحیتوں کی داد دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: ......

> ''نذیر فتح پوری نے اردو زبان و ادب کی جم کر خدمت کی ہے۔ اُن کی ان تھک جسمانی محنت اور تگ و دو اور ذہنی یکسوئی میں گذشتہ ۲۵ سال میں کوئی کمی اور سستی نہیں آئی۔ ناسازگار حالات، معاشی اور اقتصادی نشیب و فراز اور اہل ذوق و نظر کی پراسرار خاموشی نے اُن کے جذبۂ تالیف کو نہ کم کیا

اور نہ کبھی ہمت ہار کر بیٹھ رہے۔''

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ نذیر فتحپوری نے اس کتاب کو مرتب کرتے ہوئے کتنے ہفت خواں طے کیے ہوں گے۔ لیکن اُن کی محنت لگن اور صلاحیت اور اُن کے جذبۂ شوق کی داد نہ دینا کورذوقی ہوگی۔

نذیر ایک سیدھے سادھے انسان ہیں۔ ظاہری چمک دمک سے بہت دور رہتے ہیں۔ لیکن اُن کی آنکھوں کی چمک سے اس بات کا صاف طور پر اعادہ ہوتا ہے کہ اس شخص کے دل میں علم وادب کا ایک آتش فشاں پہاڑ ہے جو اُن کے فکروفن کی جولانی میں پیوست ہو کر مناسب الفاظ کا جامعہ پہن کر مناسب موقعوں پر باہر نکل جاتا ہے اور علم وادب کے میدان میں ہلچل پیدا کرتا ہے۔ ''شعرائے پونا - ایک تحقیق'' اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

''شعرائے پونہ - ایک تحقیق'' ۴۰۷ صفحات پر مشتمل نذیر کا ایک خوبصورت علمی وادبی گلدستہ ہے۔ جس میں انہوں نے ادب کے کئی گم گشتہ گوشے سامنے لائے ہیں۔ اُن کی یہ گراں قدر تصنیف حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ پونے نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ نذیر نے اس کتاب کا انتساب آفتابِ دکن حضرت شاد پونوی، عزیز العصر حضرت سلیم پونوی اور حضرت احقر جلگانوی کے نام کیا ہے۔ جن کے تخلیقی اور ادبی کارناموں کے طفیل پونہ کا ماضی ہمیشہ درخشاں رہے گا۔

نذیر، بیسویں صدی کے ایک معتبر محقق و نقاد آنجہانی کالی داس گپتا رضا کی شخصیت اور اُن کے علمی وادبی کارناموں سے بے حد مرعوب تھے۔ وہ اُن کی استادانہ صلاحیت کے قائل تھے اور اُن کی محققانہ طبیعت سے بہت متاثر تھے۔ اس میں کوئی باک نہیں کہ نذیر کی تحقیقانہ کاوشوں کے پنپنے میں رضا مرحوم کی رفاقتوں کا زبردست ہاتھ رہا ہے جس کا اعتراف خود نذیر فتح پوری اپنی تحریروں میں جگہ جگہ کرتے ہیں اور جس کی

طرف کتاب کے سرنامے میں منور پیر بھائی اشارہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''نذیر فتح پوری نے اپنی زندگی کے کئی سال نازش ادب اور ماہر غالبیات کالی داس گپتا رضا کی صحبت میں بسر کیے۔ انگنت صبحوں اور شاموں کا ایک طویل سلسلہ ہے جب انہیں گپتا رضا کی رفاقت نصیب ہوئی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ نذیر جیسا اردو ادب کا ذہین طالب علم اور اردو کا جیالا مجاہد، رضا صاحب کی محققانہ طبیعت سے متاثر ہوئے بغیر رہ جاتا۔ میرے خیال سے تحقیقی کاموں کی جانب نذیر کا یہ جوش میلان کالی داس گپتا رضا کی رفاقتوں کا ثمرہ ہے۔''

پونا کی اپنی ایک علمی وادبی روایت رہی ہے۔ یہاں کا صحت مند کلچر، یہاں کی تہذیب اور تمدن اپنی ایک انفرادی پہچان رکھتا ہے۔ یہاں نہ جانے کتنے بڑے بڑے شعراء پیدا ہوئے اور اپنے نقش پا چھوڑ کر چلے گئے۔ اس سرزمین نے باہر کے بے شمار شعرا کو اپنی طرف کھینچ لیا اور اُن کے تحقیقی سوتوں کو سینچنے میں اپنا بھرپور حصہ ادا کیا۔ لیکن افسوس یہ ساری معلومات اوراق پارینہ بن کر رہ گئے تھے۔ نذیر فتح پوری مبارکبادی کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ''شعرائے پونہ - ایک تحقیق'' کے نام سے ایک بھرپور کتاب لکھی جو اس موضوع سے بھرپور انصاف کرتی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے تقریباً تین سو سالہ شعری سفر کا احاطہ کرنے کی سعی جمیل کی ہے موصوف نے اس کتاب کو چھ ذیلی ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

پہلے باب میں پونہ...... چند حقائق کے تعلق سے انہوں نے زبان کلچر تہذیب اور تواریخی پس منظر میں ہندوستان کے اس مردم خیز خطے کے خدوخال ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ مختلف ماخذوں سے انہوں نے پونہ کے علمی وادبی روایات پر بھرپور روشنی

ڈالنے کے بعد مصدقہ ماخذوں سے پونہ کو تواریخی تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس طرح سے پونہ کی سچی اور حقیقی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

''شعرائے پونہ - ایک تحقیق'' کو نذیر فتح پوری نے چار ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔

نمبرا۔مہمان شعراء

نمبر ۲۔ مرحوم شعراء

نمبر ۳۔ موجودہ شعراء

نمبر ۴۔ ہندی مراٹھی شعراءاور انگریزی شعراء

پونہ کے مہمان شعراء کتاب کا دلچسپ باب ہے۔ یہ باب ماہ لقا چندہ سے شروع ہوتا ہے جو اپنے وقت کی ایک معروف شاعرہ اور رقاصہ تھیں۔ جنہوں نے اُس زمانے میں دکن میں شعروادب کے چراغ جلائے جب اردو شاعری میں میر تقی میر، سودا، خواجہ میر درد کی شاعری شباب پر تھی۔ محققین انہیں دوسری صاحب دیوان شاعرہ قرار دیتے ہیں۔

نذیر فتح پوری کے مطابق پونہ میں جن مہمان شعرا کا قیام رہا ہے اُن میں عدم، جوش ملیح آبادی، اختر الایمان، علامہ محوی صدیقی، علی سردار جعفری، ساغر نظامی، کیفی اعظمی، عالم فتحپوری، گیان چند جین، ضمی کاظمی، ادیب مالیگانوی، منیرالہ آبادی، مجروح سلطانپوری، ہرش چندر دکھی، مظہر امام، قتیل شفائی، محمود درانی، عتیق احمد عتیق، استاد مائل لکھنوی، بلقیس ظفیر الحسن، اور احسن رضوی داناپوری وغیرہ جیسے شعراء کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ نذیر فتح پوری نے نہایت ہی لگن محنت اور صلاحیت سے ان تمام شعراء کی شخصیت اور فن کے ساتھ ساتھ پونہ سے اُن کے علمی وادبی رشتے کو ایک نئی سمت عطا کر کے پیش کیا ہے۔ جو اُن کے محققانہ ذہن اور اُن

کی بالغ نظری کا پتہ دیتا ہے۔

کتاب کا دوسرا باب ''پونے کے مرحوم شعراء'' ہے۔ اس میں نذیر نے ۹۸ شعرا کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ جن میں یٰسین پیراں شاہ قادری، صوفی سرمست صیفر، بڑے مرہم چھوٹے مرہم، شاد پونوی، حجازی میرٹھی، احقر جلگانوی، شاگرد غالب حکیم خداداد خان، وحشی میرٹھی، استاد اندوری، ڈاکٹر عبدالحق، کالی داس گپتا رضا، ڈاکٹر عصمت جاوید، امان اختر، حنیف ساغر، نشتر اکبرآبادی، پورن کمار ہوش ، عادل پونوی، اور سیر پونوی وغیرہ کے نام نمایاں طور پر لیے جاسکتے ہیں۔ نذیر، یٰسین پیراں شاہ قادری کو پونہ کا اولین شاعر قرار دیتے ہیں۔ وہ تاریخ اردو ادب پونہ ایک تحقیق کے مصنف مرزا اکمل قادری کا حوالہ دیتے ہوئے تصوف کا شاعر قرار دیتے ہیں اور انہیں عقیدت کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ شاگردِ غالب حکیم خداداد خان کتاب کا ایک اہم اور دلچسپ مضمون ہے۔ جس میں نذیر حکیم صاحب کو ایک زود گو شاعر قرار دیتے ہیں۔ جو ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ یہ نذیر کی تحقیق و تفتیش اور کاوش پیہم کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے حکیم خداداد خان کی ۶۴ نعتوں کا گرانقدر تحفہ مشہور میلادخواں مرحوم قاسم صاحب کے فرزند صاحب حسن اشرفی (مومن پورہ) کی وساطت سے حاصل کیا اور اُن کی شخصیت اور اُن کی نعت گوئی کا تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ ''شعرائے پونہ - ایک تحقیق'' میں ''بڑے مرہم چھوٹے مرہم'' کے نام سے جو مختصر سا جائزہ پیش کیا گیا ہے وہ بھی کئی دلچسپیوں کا حامل ہے۔ نذیر کے مطابق ان دو ہم تخلص بھائیوں کے کلام میں فکر کی بلاغت، جذبات کی شدت، زبان کی صفحات اور کلام میں پختگی کا عنصر غالب ہے۔ بوستان مریم اور دیوان مریم کے نام سے اُن کا کلام آج سے ۴۰ - ۴۵ سال قبل شائع ہو چکا ہے۔ وہ پونہ کے ایک پختہ مشق اور ہر دلعزیز شاعر شاد پونوی جنہیں آفتاب

دکن ابو المعانی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے کے شعری اوصاف پر بھی بھر پور روشنی ڈالتے ہیں۔ خاک پونوی، جادو پونوی شفیق پونوی، شوق پونوی اور ممتاز پونوی کی شعری اور ادبی خدمات کو بھی نذیر یاد کرتے ہیں اور اُن کا جائزہ بڑے انوکھے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ کالی داس گپتا رضا کو ''وہ اردو شعر و ادب کے ساتھ ساتھ مصوری اور فن موسیقی کا زبردست دلدادہ قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ گذشتہ ۲۵ سال کے دوران رضا صاحب نے جتنی بھی شاعری کی وہ پونہ کی ہی دین ہے۔ وہ معروف شاعر ڈاکٹر عصمت جاوید کو ایک حقیقی شاعر قرار دیتے ہیں جو غزل کے میدان میں کما حقہ مہارت رکھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ عصمت بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار تھے۔ لیکن تحقیق تنقید اور لسانیات کے شعبے میں بھی اُن کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک بہترین مترجم بھی تھے۔ انہوں نے ترقی اردو بیورو کے لیے بھی نہایت ہی مفید کام کیا ہے۔ نذیر فتح پوری کے مطابق عصمت جاوید گونا گوں قلمی و ادبی دلچسپی کے مالک تھے۔ جن کا ادبی کام ہمیشہ وقعت کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ نذیر، نور محمد نور پونوی کو مزاح کا شاعر قرار دیتے ہیں۔ جنہوں نے پونے کے علمی و ادبی حلقوں میں ایک نیا جوش پیدا کیا۔

نذیر فتح پوری کی اس تصنیف کا تیسرا باب پونے کے موجودہ شعراء پر مشتمل ہے۔ یہ باب حکیم رازی ادیبی سے شروع ہو کر رفیق قاضی کی شخصیت اور شاعری پر ختم ہوتا ہے۔ یہ باب اس کتاب کا اہم باب اس لیے ہے کہ نذیر نے اپنے معاصرین پر نہایت ہی بے باکی اور انہماک کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔ اس باب میں بعض ایسے شعراء بھی نظر آتے ہیں جو علمی و ادبی دنیا میں اہم مقام کے حامل ہیں۔

ہندی، مراٹھی اور انگریزی شعراء ''شعرائے پونہ - ایک تحقیق'' کا آخری باب ہے۔ اس باب میں ان شعراء کے فن کا احاطہ کیا گیا ہے جو اردو زبان و ادب کے ساتھ

ساتھ ہندی، مراٹھی اور انگریزی زبان وادب پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔

کتابیات پر نظر ڈالتے ہوئے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ نذیر فتح پوری نے نہ صرف شامل کتاب شعراء کا بخوبی سے مطالعہ کیا بلکہ مختلف تنقیدی، تحقیقی اور عصری تحریروں کے صفحات کو بھی کھنگالا ہے۔ اُن کی زبان صاف، شستہ اور پاک ہے۔ اُن کی تحریروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادب کا عمیق مطالعہ رکھتے ہیں۔ بات سے بات پیدا کرنا شروع سے ہی اُن کا خاصہ رہا ہے۔ وہ جچے تلے انداز میں بات کہنے کے قائل ہیں۔ نذیر فتح پوری کا اسلوب نرالا ہے۔ وہ نہایت ہی دیانتداری سے شاعر کا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر اپنے مشاہدے سے اُس کے تجربے میں شامل ہو کر خاکہ تیار کرتے ہیں اور اس کے بعد صاف اور سلیس الفاظ کے سہارے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ شعرائے پونہ-ایک تحقیق میں ان تمام چیزوں کو خاطر میں لانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے جو اس کتاب کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

ڈاکٹر پریمی رومانی، جموں

****

نذیر فتحپوری کی ادبی فتوحات میں ایک منفرد تاریخی اضافہ

ڈاکٹر محبوب راہی

نذیر فتحپوری کا نام اب اردو شعر ادب کی ایک معتبر، مؤقر اور منفرد حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ ان کا یہ اعتبار وقار اور انفرادیت کسی ایک جہت، کسی ایک سمت یا کسی ایک صنف پر مبنی نہیں ہے۔ گذشتہ کم وبیش چار دہائیوں سے ان کا تخلیقی سفر بیک وقت کئی جہتوں، کئی سمتوں اور کئی منزلوں پر نہایت استقلال، ثابت قدمی، اولوالعزمی اور سرعت رفتاری کے ساتھ جاری ہے۔ جس کا مثبت نتیجہ شاعری میں غزل، نظم، آزاد غزل، ماہیا، نعت، طفلی منظومات اور متفرقات نیز نثر میں ناول، تحقیقی، تنقیدی اور طبعزاد مضامین پر مبنی اکیس ۲۱ کتابوں کی صورت میں برآمد ہوا جو منظر عام پر آ کر قبولیت خاص و عام کی سند حاصل کر چکی ہیں۔ علاوہ ازیں دیوناگری رسم الخط میں بھی ان کا ایک شعری مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ نامساعد حالات میں مسلسل بائیس برسوں تک اردو کا رسالہ ''اسباق'' جاری رکھنے، اسے زندہ و تابندہ رکھتے ہوئے عالمگیر پیمانے پر اسے وقار و اعتبار حاصل کروانے کے لیے انھیں اپنے قلب و جگر کا کتنا خون صرف کرنا پڑا ہے اس کا ٹھیک اندازہ دورِ حاضر میں اردو صحافت کے خارزاروں میں رہنے تلوے لہولہان کرنے والوں یعنی اردو کے صحافیوں ہی کو ہے۔ اسباق پبلیکیشنز کے زیر اہتمام اردو شعر و ادب کی لگ بھگ پچاس کتابیں منظر عام پر لانے کا اعزاز بھی نذیر فتحپوری کو حاصل ہے (جن میں میرے اپنے چوتھے شعری مجموعے پیش رفت کو بھی یہ سعادت حاصل ہے) زمانہ لاکھ قدر ناشناس سہی، لیکن ...... اب اتنی ساری چمچماتی، جگمگاتی خدمات سے بھی یکسر تو آنکھیں چرائی نہیں جا سکتیں۔ لہٰذا قدرے تاخیر سے سہی نذیر کی خدمات کا اعتراف کیا گیا اور بھرپور کیا

گیا۔لہٰذاان کی بیشتر تصانیف پر انھیں کئی ریاستی اور کل ہند انعامات سے نوازا گیا۔ملک کے طور وعرض میں سرگرم کار کئی ادبی اور ثقافتی انجمنوں نے انھیں نقد انعامات اور اعزازات عطا کیے۔کئی رسائل نے ان کی شخصیت اور فن پر خصوصی نمبر اور گوشے شائع کیے۔کئی قلمکارروں نے ان کی شخصیت اور ادبی کارناموں پر کتابیں ترتیب دے کر شائع کیں۔اردو کے علاوہ ہندی، مراٹھی اور انگریزی کے بڑے اخبارات نے ان کے انٹرویوز شائع کیے۔راجستھان کی نصابی کتابوں میں ان کی نظمیں شامل کی گئیں۔مختصر یہ کہ انعامات، اعزازات اور اعترافات کا ایک سلسلۂ لامتناہی ہے جو نذیر فتحپوری کی گونا گوں ادبی تحقیقی اور صحافتی خدمات سے وابستہ ہے۔

دراصل مجھے نذیر فتحپوری کی تازہ ترین تصنیف ''تاریخ وتذکرۂ فتح پور شیخاواٹی'' پر سرسری تبصرہ کرنا ہے جسے میں نے ان کی ادبی فتوحات میں ایک منفرد تاریخی اضافے سے تعبیر کیا ہے۔لیکن کیا کیجیے کہ نذیر کی چار دہائیوں پر محیط پے بہ پے اور رنگا رنگ ادبی محاذ آرائیاں اور فتوحات کی تفصیلات میری نگاہوں کے سامنے ہیں لہٰذا ان سے صرف نظر کر جانا بھی میرے لیے ممکن نہیں ہے۔

عرض مدعا یہ کہ نذیر فتحپوری جو اردو شعر وادب کی تمام مروجہ اور نو آمدہ اصناف نظم ونثر پر مشتمل اکیس کتابوں کے وسیلے سے ادبی دنیا میں اپنی ہمہ جہت ادبی شناخت مستحکم کروا چکے ہیں۔زیر تبصرہ کتاب کے حوالے سے وہ ایک کامیاب تاریخ نویس اور دیانتدار تذکرہ نگار کی اپنی تازہ ترین پہچان کے ساتھ اپنے آپ کو متعارف کروا رہے ہیں۔ویسے انھیں نیا کرنا ہی کیا تھا چالیس سالہ تخلیقی، تحقیقی، تنقیدی، تصنیفی اور تالیفی تجربات تو انھیں حاصل ہیں ہی صحافتی تجربات کے ساتھ ساتھ پچھلے کچھ برسوں سے شاعروں اور سمیناروں کے وسیلے سے انھیں سیاحتی تجربات بھی حاصل ہو رہے ہیں۔ممکن ہے ان کا فعال اور متحرک ذہن مستقبل قریب میں سیاحت نامہ یعنی سفرنامہ منظر

عام پر لانے کا خاکہ بن رہا ہو۔ ان کا اشہب قلم گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا ہے۔ بس ذرا ایک نئی سمت سفر کی طرف قلم موڑنے کی دیر تھی منزل کامرانی پر پہنچ کر نذیر کے لیے ایک کامیاب تاریخ و تذکرہ نگار کی بشارت لے کر ہی لوٹا۔

راجستھان کا تاریخی شہر فتحپور شیخاواٹی نذیر فتحپوری کا مولد و مسکن ہے۔ اور بقول احمد علی خاں منصور چوروی بتیس پیڑھی قبل شیخاواٹی کے راجپوت حکمران ان دونوں کے جد امجد تھے۔ کسب معاش کے سلسلے میں نذیر کی زندگی کا بیشتر حصہ ان کے آبائی وطن سے زیادہ مہاراشٹر کے شہر پونہ میں گزرا لیکن اپنے وطن کے ساتھ ان کا جذباتی لگاؤ دیوانگی کی حد تک برقرار رہا۔ اسی شدید قلبی لگاؤ اور گہری ذہنی اور جذباتی وابستگی کے طفیل ان سے اس کتاب کے لکھنے چھپنے تک کا عظیم کارنامہ انجام پذیر ہوا۔

فتحپور کی تاریخی عمارتوں اور حکمرانوں کی چکنے گلیزڈ کاغذ پر دلکش اور رنگین تصاویر سے مزین سرورق اور پختہ جلد میں ملفوف پونے دو سو صفحات پر نذیر فتحپوری نے فتحپور کی تاریخ کے تمام روشن ابواب اور تابناک دریچے سجا کر رکھ دیے ہیں۔ ابتدائی چار صفحات پر فتحپور کے نوابوں، فتح پور ریلوے اسٹیشن، موجودہ شہر کا دلکش ہوائی منظر، مقابر، مساجد، منادر اور شعرائے کرام کی رنگین، دلکش اور جاذب نظر تصویریں ہیں۔ نذیر فتحپوری کی ایک جذباتیت انگیز اور پر اثر نظم ''ایک نظم فتح پور کے نام'' سے تذکرے کا آغاز ہوتا ہے۔ نظم کا ہر ہر لفظ وطن کے تئیں شاعر کے والہانہ عشق کا غماز ہے۔ گفت باہمی کے ذریعے نذیر نے کتاب کے وجود میں آنے کے محرکات پر روشنی ڈالی ہے۔ مشہور شاعر، ادیب اور نقاد ڈاکٹر فراز حامدی نے دس صفحات پر پھیلے اپنے مفصل پیش لفظ میں اردو تذکرہ نگاری کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے زیر تبصرہ تذکرے کو شیخاواٹی کا اولین تذکرہ قرار دیا ہے۔ بزرگ اور محترم شاعر احمد علی خاں منصور پوروی نے نذیر فتحپوری ......میری آنکھ کا آنسو' عنوان کے تحت نذیر کے ساتھ اپنے قلبی لگاؤ۔ ذہنی ہم آہنگی اور

جذباتی وابستگی کا نہایت شدید اور متاثر کن جذباتیت کے ساتھ اظہار کیا ہے جس کا جواز ان کے نزدیک نذیر کا بتیسویں پیڑھی میں ان کا بھائی ہونا ہے۔ بقول ان کے نذیر کے اجداد نے ۸۰۰ سال تک موجودہ شیخاواٹی کے ساتھ ساتھ چورو، ناگور ضلعوں کے خطہ بسیط پر حکومت کی ہے۔''

ڈاکٹر فراز حامدی اور منصور چودھری کا راست تعلق شیخاواٹی سے ہونے کی بنا پر نذیر فتحپوری کے اس تذکرے کی صداقتوں پر ان حضرات کی گواہی اس کتاب کو درجۂ اعتبار عطا کرتی ہے۔

فتحپور کی موجودہ صورت حال سے تذکرے کی شروعات کرتے ہوئے چھتیس ذیلی عنوانات کے تحت قائم خانی کی ابتدا سے لے کر باشندگان فتح پور، قیام فتحپور کے تاریخی تضادات، شہنشاہ بابر فتحپور میں، تاج بی بی، فتح پور کے شیخاوت حکمرا، فتحپور کی مسجد میں کنوئیں، حویلیاں، پہلی تصنیف کے خالق، ادبی انجمنیں، مشاعرے، مہمان، مرحوم اور موجودہ شعراء، تعلیمی ادارے اور سیاسی وسماجی شخصیات پر تذکرے کا تمت بالخیر ہے۔ آخری صفحہ پر کتابیات کے تحت ستائیس کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔

نذیر فتحپوری نے تحقیق وجستجو کے تمام تر تقاضوں کی تکمیل کرتے ہوئے فتح پور کے قیام سے آج تک تمام قابل ذکر تاریخی سیاسی، سماجی، علمی وادبی حالات وواقعات یکجا کر کے نہایت خوش سلیقگی اور حسن ترتیب کے ساتھ دنیا کے سامنے آئینے کی طرح روشن کر دیے ہیں۔ ان کی تحقیق کے مطابق ۱۴۴۶ء میں قائم خانی نواب فتح خاں نے اپنے نام پر فتحپور شہر کا نام رکھا، شہنشاہ بابر نے فتحپور آ کر قیام فرمایا۔ نواب نعمت خاں پہلے شاعر ہوئے۔ جنہوں نے مختلف موضوعات پر چھہتر کتابیں لکھیں۔ غلام یٰسین خان نے ''منہاج الدارین'' اور ''زیارت حرمین'' جیسی کتابیں لکھیں۔ مشہور عالم دوہا ہے

کاگا سب تن کھائیو چن چن کھائیوں ماس

دو نینا مت کھائیو پیا دیکھن کی آس

جو بابا فریدؒ سے منسوب ہے فتحپور کے پانچویں نواب قدن خاں کی بیٹی تاج بی بی کی تخلیق ہے۔

فتحپور سے متعلق ایسے درجنوں تاریخی انکشافات ''تاریخ وتذکرہ فتحپور شیخاوائی'' کے صفحات پر بکھرے پڑے ہیں جو نذیر فتحپوری کی محققانہ عرق ریزی اور عالمانہ وقعت نظری کا ثبوت ہیں۔ کچھ اور چیزیں جو اس تذکرہ کی دلچسپیوں میں خوشگوار اضافوں کا موجب ہیں ان میں سے چند ہیں فتحپور کے میلے، ٹھیلے تہوار ان میں گائے جانے والے لوگ گیت، قوالیاں، عارف فتحپوری کا استقبالیہ نغمہ، مہمان شعراء مثلاً عشرت دھولپوری، دلدار ہاشم، مخمور سعیدی، شین کاف نظام، راشد ٹونکی، فراز حامدی، فاروق انجینئر، اظہار مسرت، ملکہ نسیم وغیرہ کا تعارف اور نمونہ کلام، نیز فتح پور کے پندرہ مرحوم اور پچیس بقید حیات شعرائے کرام کے تعارف نامے مع نمونہ کلام کے سات تذکرہ نگار کی ''صحن عید گاہ میں ایک نظم'' اور ''تو صحبت کا ہے ایک گھر عید گاہ'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ گرنا توں دلچسپیوں، نئے نئے انکشافات، دلکش انداز تحریر اور شعر و ادب کے خوب سیرت...... سے آراستہ منفرد خوبیوں کی حامل یہ کتاب نذیر فتحپوری کی کثیر الجہات ادبی شناخت کو بحیثیت تذکرہ نگار ایک نئی جہت عطا کرنے کا موجب ہوگی نیز اس کے وسیلے سے ان کا شمار اردو کے چند معروف تذکرہ نگاروں میں کیا جائے گا ایسی توقع کی جاسکتی ہے۔ گھسے پٹے موضوعات پر آئے دن منظر عام پر آنے والی کتابوں کے انبار میں تاریخ تذکرہ جیسے منفرد موضوع پر دستاویزی نوعیت کی یہ کتاب ایک سو ساٹھ روپے بھیج کر مصنف سے 230/B/120 وِمان درشن لوہ گاؤں روڈ پونے 411001 پر رابطہ کر کے حاصل کی جاسکتی ہے۔

****

تاریخ وتذکرہ فتح پور شیخاواٹی

نورالحسنین

نذیر فتح پوری نام ہے ایک ایسے شخص کا جو شاعر بھی ہے، ادیب بھی ہے، نقاد بھی ہے اور 'اسباق' جیسے رسالے کا مدیر بھی۔ تاریخ وتذکرہ فتح پور شیخاواٹی لکھ کر انھوں نے ثابت کردیا کہ ان کے اندر ایک مورخ بھی موجود ہے۔

ایک ایسے دور میں جبکہ مستند تاریخی کتابیں مسخ کی جارہی ہوں۔ نصاب سے علاقائی تاریخ کو ختم کیا جارہا ہو خصوصاً مسلم دور۔ نذیر فتح پوری نے اپنے علاقے کی تاریخ مرتب کر کے اس کی تہذیب وتمدن، اس کے حکمرانوں کی وسیع النظری، اس کے زبان وادب کے ارتقاء کی داستان کو محفوظ کردیا ہے۔

نذیر نے کتاب کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ہر باب کا ایک علیحدہ عنوان بھی رکھا ہے۔ چونکہ وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں اس لیے بطورِ خراج عقیدت فتح پور کے نام ایک خوبصورت نظم بھی کہی ہے۔ قاری کتاب کا سرورق پلٹتے ہی فتح پور شیخاواٹی کے نوابین، حکمرانوں و تاریخی عمارتوں کی خوبصورت رنگین تصویروں میں کھو جاتا ہے۔

آیئے دیکھیں ہندوستان کے جغرافیہ میں فتح پور شیخاواٹی کہاں ہے؟

۱۴۵۱ء میں نواب فتح خان نے 'تھار' کے ریگستان میں اس قصبہ کی بنیاد رکھی اور اسے اپنے نام پر فتح پور کا نام دیا چونکہ فتح پور راجستھان کے شیخاواٹی علاقے میں آباد ہے۔ اسی لیے فتح پور کے ساتھ شیخاواٹی بھی لگایا جاتا ہے۔

مذکورہ کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس علاقے میں بارہ نوابوں نے نہایت شان وشوکت کے ساتھ ۲۸۰ برسوں تک حکومت کی۔ یہ نواب بڑے فراخ دل

تھے۔ اپنی ہندو رعایا کا بھرپور خیال رکھتے تھے۔ انھیں ہر طرح کی سماجی معاشرتی آزادی حاصل تھی۔ ان کے عہد میں مسجدوں اور تاریخی عمارتوں کے ساتھ ہی ساتھ بے شمار منادر بھی تعمیر کیے گئے۔ علم وادب کی بھی سرپرستی ہوئی۔ انھوں نے مذہبی بنیادوں پر کبھی تلوار نہیں اٹھائی اور ایک ایسا سیکولر نظام قائم کیا جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ان نوابین کے بعد فتح پور کے راجپوت حکمرانوں نے ۲۱۶ برس یعنی ۱۹۴۷ء تک نہایت کرّ وفر کے ساتھ حکومت کی۔

کتاب کا وہ حصہ سب سے زیادہ عمدہ ہے جہاں نذیر فتح پوری نے اپنے علاقے کے رسم ورواج میلے ٹھیلے، عیدین وتہواروں کا نقشہ کھینچا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

''راجستھان میں میلے ٹھیلے نہ ہوں تو اس کی رونق ماند پڑ جاتی ہے، شیخاواٹی کے مسلمانوں کے عام تہوار تو عید الفطر اور عید الاضحیٰ ہی ہیں۔ لیکن محرم کے مہینے میں تعزیہ داری کا تہوار بھی نہایت جوش وخروش سے منایا جاتا ہے۔

محرم کے مہینے میں چھوٹے اور بڑے امام حسین کے فقیر بن کر گھر گھر مانگنے جاتے ہیں، باجرہ، گیہوں، مونگ، مونٹھ ایک ہی جھولی میں جمع کرتے ہیں، پھر اُس کا کھچڑا بنا کر بستی کے غریبوں میں تقسیم کرتے ہیں......

ساون کے مہینے میں یہاں تیج تہوار ہندو عورتوں میں دھوم دھام سے منایا جاتا ہے، جب برسات ہوتی ہے تو بوندوں کے ساتھ لال رنگ کی تیجوں کی بارش ہوتی ہے۔ بھوری مٹی کی زمین پر یوں لگتا ہے جیسے کسی نے لال موتیوں سے جڑی چنری دھرتی کے جسم پر ڈال دی ہے......''

غرض نذیر فتح پوری نے مختلف مذہبی رسومات اور میلے ٹھیلے کی نہایت خوبصورت

عکاسی کی ہے۔ فتح پور کی ایک اور خوبی کا ذکر انھوں نے اس طرح کیا ہے:

''فتح پور بھوک سہہ سکتا ہے۔ پیاس سہہ سکتا ہے۔ سارے دکھ اٹھا سکتا ہے۔ تکلیف برداشت کر سکتا ہے لیکن گائے بنا نہیں رہ سکتا۔ فتح پور آنسوؤں میں ڈوب کر بھی گائے گا اور گائے گا ضرور۔''

کتاب کا مطالعہ ہمیں فتح پور کی مختلف مسجدوں، تاریخی حویلیوں، کنوؤں اور برجوں کی بھی سیر کرواتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ جدید فتح پور کی تصویر بھی دکھاتا ہے۔

تاریخ و تذکرہ فتح پور شیخاوٹی میں اس کی ادبی تاریخ پر بھی بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے کوی نعمت خان ہو یا تاج بی بی کے ادبی کارنامے، اردو ادب کے طالب علموں کی معلومات میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ نذیر فتح پوری نے مرحوم شعراء، حالیہ شعراء، مہمان شعراء اور ایسے شعراء کا بھی ذکر کیا ہے جو باہر سے آئے اور یہاں پر بس گئے۔ اس تذکرے میں شعراء کی فہرست میں خود نذیر فتح پوری کا بھی تذکرہ ہے۔ بلکہ ان کی ادبی خدمات اور ان کی شاعرانہ عظمتوں کے اعتراف میں احمد علی خان منصور چوروی کا بھرپور مضمون بھی شامل ہے۔

یہ کتاب فتح پور کی سیاسی زندگی، سماجی شخصیات، مختلف ادبی و تعلیمی اداروں کا بھی احوال پیش کرتی ہے۔

کتاب مجلد ہے ٹائٹل دیدہ زیب چار رنگوں سے مزین ہے۔ کاغذ بھی عمدہ استعمال کیا گیا ہے۔ طباعت و کتابت معیاری ہے۔ ادب کے وہ طالب علم جو تاریخ کے بھی شیدائی ہوں، ان کے لیے یہ کتاب ایک انمول تحفہ ہے اور ان علاقوں کے لیے جن کی تاریخ ابھی تک لکھی نہیں گئی۔ ان کے مصنفین کے لیے دعوت عمل بھی ہے۔ اس کتاب پر نذیر فتح پوری کو مبارکباد ملنا چاہیے۔

اورنگ آباد

پونے میں اردو افسانہ - ایک تحقیق

مرتب: نذیر فتح پوری

ناشر: حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ (پونے)

مبصر: ڈاکٹر محبوب راہی (بارسی ٹاکلی، ضلع اکولہ)

بحیثیت شاعر، فکشن نگار، نقاد، محقق، مبصر، مترجم اور مرتب اکتالیس (۴۱) مختلف الاصناف تصانیف نو بہ نو کے انبار در انبار لگانے، کم و بیش اتنے ہی غیر مطبوعہ مسودات تیار کر کے رکھنے۔ بحیثیت پبلشر دیگر قلمکاروں کی اسّی (۸۰) کتابیں با اہتمام منظر عام پر لانے اور بحیثیت مدیر مسلسل ۳۰ برسوں سے اسباق کے عام شماروں کے علاوہ کئی خاص نمبر کو تسلسل کے ساتھ شائع کرنے کے بعد تکان نہیں تو کم از کم اضمحلال طاری ہونا عین متقاضائے فطرت ہوتا لیکن اللہ نظر بد سے محفوظ رکھے، نذیر فتح پوری کی جسمانی توانائیوں، ذہنی جولانیوں، حوصلوں کی فروانیوں، فکر و شعور کی ندرتوں تخلیقی صلاحیتوں، نقد و نظر کے تحمل اور تجمل کے ساتھ جوش عمل کے تسلسل کو۔ کہ موصوف کی رفتارِ کار دن بہ دن فزوں تر ہوتی جارہی ہے۔ ابھی ابھی چار سو صفحاتی ضخیم اسباق کا ماں نمبر پیش کر کے اس موضوع پر اولیت اور سبقت حاصل کرنے پر دنیائے ادب و صحافت میں داد و ستائش کی گونج ذرا مدھم بھی نہیں ہونے پائی کہ ''پونے میں اردو افسانہ'' عنوان کے تحت سوا دو سو صفحات پر محیط دستاویزی نوعیت کی تاریخی کتاب نہایت اہتمام و انصرام کے ساتھ کرشماتی انداز میں منظر عام پر لے آئے۔

''پونے میں اردو افسانہ'' نذیر فتح پوری نے خود اسے چونکا دینے والا عنوان کہہ کر سوالیہ نشان لگایا ہے کہ تذکروں میں اس شہر علم و فضل کے ساتھ صف اول کے (نام

نہاد ہی سہی) کسی افسانہ نگار کی وابستگی پڑھنے یا سننے میں نہیں آئی، لیکن نذیر فتح پوری کی متجسس کاوشوں نے تحقیق و تدقیق کے خارزاروں سے گزر کر دو چار نہیں پورے اکیس افسانہ نگاروں کی فہرست زمانی ترتیب سے کتاب کے خوش رنگ دیدہ زیب اور دلفریب جگ مگ کرتے سرورق پر روشن الفاظ میں ایک چیلنج کی طرح چسپاں کر دی ہے۔ جس میں بیک نظر کرشن چندر، منٹو اور سلیم اختر کے نام دیکھ کر حیرت ہوتی ہے لیکن نذیر کی پیش کردہ تفصلات کی روشنی میں یہ مشاہیر شہر پونہ میں قلیل یا طویل عرصہ قیام پذیر رہتے ہوئے یہاں ایک یا ایک سے زیادہ کہانیاں لکھی ہیں۔ ہر افسانہ نگار کے پونہ سے متعلق مختصر کوائف کا ذکر کرتے ہوئے کرشن چندر کی یہاں تخلیق کردہ دو کہانیوں ''ان داتا'' اور موبی میں سے ایک ان داتا ''منٹو کی ممی'' اور سلیم اختر کا ''جنم روپ'' شامل کیے گئے ہیں۔ نذیر فتح پوری کی تحقیق کی روشنی میں پونے میں پہلا افسانہ درانی نے لکھا جن کا تعلق حیدر آباد سے تھا اور جو پونہ سے فروری ۲۳ء میں جاری ہونے والے ماہنامہ گلزار سخن (مدیر حجازی میرٹھی) کے پہلے شمارے میں شامل تھا۔ ماہنامہ گلزار سخن کی افسانوی خدمات عنوان کے تحت نذیر نے اس رسالہ کا مختصر تعارف بھی پیش کیا ہے۔

پونہ سے ۵۲ء میں ڈاکٹر امانت اور اثر مستطی کی زیر ادارت شائع ہونے والے ماہنامہ شاہین (جس سے مرحوم امین حزیں بھی وابستہ تھے) کے پہلے شمارے پر روشنی ڈالتے ہوئے اس میں شامل چار افسانوں کی نشاندہی کرتے ہوئے پریم شرر کا مختصر افسانہ ''بوڑھی مالن'' جو اس کتاب کا دوسرا افسانہ ہے اس کے بعد متذکرہ بالا تینوں مشاہیر کے بعد بالترتیب ڈاکٹر عصمت جاوید شیخ، مس خورشید نکہت، ایم ایف پرویز، نذیر فتح پوری، رشید اعجاز، مشتاق مدنی، قاضی مشتاق، خالد انصاری، زین العابدین خاں، بلقیس ظفیر الحسن، رفیق جعفر، معراج انور، اندرا شبنم اندو، نسرین رمضان سید، شیخ طاہرہ عبدالشکور اور شمشاد جلیل شاد کا ایک ایک افسانہ نیز آخر الذکر تین کے ماسوا سبھی

کے مختصر تعارف اور تجزیات نہایت فنکاری اور جامعیت کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں میں چند ایک کے علاوہ باقی تمام بیرون پونہ کے متوطن ہیں۔ جو عارضی یا مستقل طور پر پونہ میں قیام پذیر رہے۔ خود نذیر فتح پوری راجستھان (فتح پور) کے باشندے ہیں۔ اس لیے کتاب کا عنوان ''پونے میں اردو افسانہ'' رکھا ہے۔ یعنی پونہ میں دورانِ قیام تخلیق کیے گئے افسانے۔ پونہ فلم سازی کا اہم مرکز رہا ہے۔ لہٰذا فلم سے متعلق اردو کے ہر بڑے سے بڑے قلمکار کا پونہ میں کم وبیش مدت کے لیے قیام رہا ہے۔ اس اتفاق کو نذیر فتح پوری نے کتابوں میں محفوظ کرتے ہوئے ''شعرائے پونہ ایک تحقیق'' میں جوشؔ، ساغرؔ...... وغیرہ شعراء اور اب ''پونہ میں اردو افسانہ'' میں کرشن چندر اور منٹو کو پونہ کی ادبی تاریخ سے وابستہ کرتے ہوئے پونہ کی ادبی اہمیت میں اہم اضافہ کر دیا ہے۔ ابتدائی صفحات میں عرضِ ناشر کے تحت منور پیر بھائی نے ادارے کی تعلیمی میدانوں میں بے مثال پیش رفت کے ساتھ پونہ کی علمی ادبی، تہذیبی، ثقافتی اور ملی قدروں کی ترجمان اہم کتابیں شائع کرنے کے اپنے قابلِ تقلید تاریخی نوعیت کے اقدام کا ذکر کرتے ہوئے نذیر فتح پوری کی ادبی خدمات اور پونے سے ان کی شدید قلبی وابستگی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے ''پونے سے جو محبت کرتا ہے۔ پونے بھی اسے گلے لگالیتا ہے۔'' یہ کتاب ان دونوں محبتوں کا روشن آئینہ ہے۔ گفتِ باہمی، پونہ میں اردو افسانہ اور پونے میں ناول نگاری'' ان تین عنوان کے تحت نذیر فتح پوری نے اپنی مختلف الجہات ادبی کارگذاریوں کے دوران احباب منافقتوں میں چند تکلیف دہ تجزیات طنز لطیف کے پیرائے میں منکشف کیے ہیں۔ موصوف کے ان منکشف کردہ حقائق میں اپنے دو مطبوعہ اور دو غیر مطبوعہ ناولوں سے پہلے مس خورشید نکہت کے چھ ناولوں اور چار ترجمہ شدہ ناولوں کی اشاعت، بعد ازاں قاضی مشتاق کے سولہ (بشمول چھ جاسوسی) ناولوں کی اشاعت، ماہنامہ شاعر ۷۲ء میں اپنے افسانے کی اشاعت

”ادارۂ اسباق کی افسانوی خدمات کے تحت قاضی مشتاق احمد کی تین کتابوں کی اشاعت ، قاضی صاحب کے فکر و فن پر اسباق کے دو خصوصی شمارے اور ایک کتاب ”اردو افسانے کی مقبول ترین آواز کی اشاعت وغیرہ کا مفصل ذکر ہے۔

نذیر فتح پوری خود بھی ایک منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں جس کا ثبوت اس کتاب میں شامل عصری دلدوز اور جانسوز مسائل پر ان کا تاثر انگیز افسانہ ”اجالے کی طرف“ ہے بالخصوص جس کا اختتامیہ عام ڈھروں سے ہٹ کر بے حد چونکا دینے والا ہے۔ نذیر نے کتاب میں شامل افسانوں کے مختصر تجزیے بھی نہایت فنکارانہ انداز میں کیے ہیں۔ زبان و بیان کی شائستگی اور طرزِ اظہار کی شستگی اس پر مستزاد ہے۔ پونہ کی ادبی تاریخ کے ساتھ ساتھ اردو افسانے پر بھی یہ کتاب دستاویزی اہمیت کی حامل ہے جس کے لیے نذیر فتح پوری کے ساتھ محترم منور پیر بھائی داد و تحسین کے مستحق ہیں، حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ پونے“ اس پتے پر محض دو سو روپے بھیج کر مظہر امام اور سلیم اختر جیسے مشاہیر سے داد پانے والی یہ کتاب حاصل کی جا سکتی ہے۔

****

جگن ناتھ آزاد۔ ایک مستقل ادارہ

مصنف: نذیر فتح پوری

تبصرہ نگار: کلدیپ گوہر

اردو ادب کی دنیا میں نذید فتح پوری کا نام اب کسی تعارف کا محتاج نہیں رہا۔ وہ ''اسباق'' ادارے سے منسلک ہیں۔ گزشتہ بیس برسوں میں معتبر اخبارات ورسائل میں ان کی نظمیں، غزلیں، علمی مضامین شائع ہوکر مقبول ہو چکے ہیں۔ ان کی اہم تصانیف مثلاً چٹانوں کے بیچ، زخم اور آہیں، لمحوں کا سفر، لفظوں کے سائے تلے اور ریگ رواں کی اشاعت کے بعد ان کی ادبی شخصیت میں اور بھی جامعیت آگئی ہے۔ ان کی تازہ پیش کش ''جگن ناتھ آزاد۔ ایک مستقل ادارہ'' کی اشاعت ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے برصغیر ہندو پاک کے معروف شاعر، ادیب اور ماہر اقبالیات پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی شخصیت، فن اور ادبی خدمات کے اعتراف میں ممتاز اور ماہر اہلِ قلم کے ٹھوس، جامع اور وقیع مقالات کے اقتباسات شامل کیے ہیں۔ آزاد کے ادبی کارناموں پر جو کتابیں اور رسالوں کے خاص نمبر شائع ہوئے وہ تاریخ ادب کا ایک محفوظ سرمایہ ہیں ان قابلِ ذکر اشاعتوں میں اہم ہیں (۱) جگن ناتھ آزاد کی شاعری مرتبہ حمیدہ سلطان احمد، (۲) جگن ناتھ آزاد ایک مطالعہ مرتبہ محمد ایوب واقف، (۳) ماہنامہ العطش، (جموں) جگن ناتھ آزاد نمبر مرتبہ راج کمار چندن، (۴) ماہنامہ لمحے لمحے بدایوں کا جگن ناتھ آزاد نمبر مرتبہ حبیب سوز خاں فہیم، (۵) جگن ناتھ آزاد حیات اور ادبی

خدمات مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم (۶) ارمغانِ آزاد مرتبہ ڈاکٹر ظہور الدین۔

زیر نظر کتاب میں ۲۸ مضامین شامل ہیں جن میں جگن ناتھ آزاد پونہ میں، مالیگاؤں مہاراشٹر کا سہ ماہی رسالہ توازن اور آزاد، آزاد اور انصاری، آزاد اور لاہور، آزاد کی کہانی تصویروں کی زبانی، آزاد پانچ بڑوں کی نظر میں، دبئی میں جشن آزاد، شعری مجموعہ نوائے پریشاں کی غزلیں اور نظمیں، ان کے علاوہ پاکستان کے پہلے ترانے کا خالق آزاد کی رباعیات، آسام اور آزاد، مدراس کے ساحل پر جیسے اہم شخصیت اور فن کو نئے زاویہ میں پیش کیا ہے۔ ''لاہور اور آزاد'' یہ دل کش مضمون ہے۔ لاہور سے ہجرت آزاد کے ذہنی کرب کا باعث بنی۔ تقسیم وطن کے بعد ایک اجنبی مسافر کے روپ میں جب آزاد نے لاہور میں قدم رکھا تو لاہور کی فضا میں ان کے یہ اشعار گونج اٹھے۔

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
کہ اپنے آپ کو مانند مہماں لے کے آیا ہوں
تمہارے واسطے اے دوستو میں اور کیا لاتا
وطن کی صبح تک شام غریباں لے کے آیا ہوں

وطن میں ایک غریب الدیار آیا ہے
خدا کرے کہ اسے یاں کوئی نہ پہچانے

''دبئی میں جشن آزاد'' اس مضمون میں جشن کے موقعہ پر جو خوب صورت مجلّہ شائع ہوا تھا اس کے مقالات کے اقتباسات دیے گئے ہیں۔ اہم مقالہ نگاروں کے یہ تاثرات پیش کیے ہیں :

پروفیسر عنوان چشتی: میں جگن ناتھ آزاد کی تخلیقی توانائی کا قائل ہوں کہ وہ اس عمر

میں بھی لکھ رہے ہیں اور خوب لکھ رہے ہیں۔

جناب اکرام ذکی: جگن ناتھ آزاد بھارت میں ایک لحاظ سے پاکستان کا تہذیبی سفیر ہے۔

جناب محشر بدایونی: ہم آزاد کو بجا طور پر اقبال کی انسائیکلو پیڈیا کہہ سکتے ہیں۔

پروفیسر اشتیاق عابدی: جگن ناتھ آزاد انسانی عظمتوں کا شاعر ہے۔

''جگن ناتھ آزاد پانچ بڑوں کی نظر میں'' اس مضمون کے تحت پانچ اصحاب نے اپنے اپنے ڈھنگ سے آزاد کی ادبی حیثیت کا اعتراف کیا ہے شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں کہ'' آزاد کے یہاں دردمندی، وسیع النظری، انسان دوستی کے عناصر کلاسیکی عزم و احتیاط کے ساتھ تصنع اور تکلف کے بغیر یکجا ہیں۔ (۲) خلیق انجم نے آزاد کو اردو کا کلاسیکی شاعر تسلیم کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان کی شاعری سیکولر انسان کے ذہن کی پیداوار ہے۔ (۳) مظہر امام نے آزاد کو آفتاب تازہ کہہ کر مخاطب کیا ہے اور آزاد کے تین سفر ناموں جنوبی ہند میں دو ہفتے ،م پسکن کے دیس میں، کولمبس کے دیس میں، کو صحیح معنوں میں سفر نامے کہلانے کا مستحق قرار دیا ہے۔ (۴) جوگندر پال نے آزاد کو اردو کا دولہا کہہ کر مخاطب کیا ہے اور لکھا کہ ایسے .... مصنف نے سیر حاصل تبصرہ لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ آزاد کو نظم غزل اور رباعی کی اصناف پر مکمل عبور حاصل ہے۔ مدراس کے ساحل پر ذکر دکن ،آسام اور آزاد ان مضامین میں آزاد کا ان مقامات پر سفر اور ان کے اعزاز میں جو ادبی محفلیں منعقد ہوئیں ان کی تفاصیل پیش کی ہیں۔ کتاب کے صفحہ ۶۳ ۔ ۱۶۲ ر پر آزاد کے شعری مجموعہ ''بیکراں'' پر ڈاکٹر نہال احمد صدیقی کا جو تبصرہ ہے اس میں لکھا ہے کہ آزاد شاعری میں علامہ اقبال کے شاگرد ہیں۔ تبصرہ نگار سے سہو ہوا ہے آزاد شاعری میں شمس العلما مولانا تاجور نجیب آبادی کے شاگرد ہیں۔ ''آزاد کی کہانی تصویروں کی زبانی'' یہ مضمون کتاب کے ۲۷

صفحات پر محیط ہے ، اس میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ فلاں فلاں تقریب میں کھینچی گئی تصویر میں پروفیسر آزاد کن کن برگزیدہ ہستیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر متعلقہ تصاویر بھی کتاب میں شائع کی جاتیں تو قاری زیادہ لطف اندوز ہوسکتا تھا۔ بہر حال نذیر فتح پوری کی کتاب ایک جرأت مندانہ اقدام ہے۔ انھوں نے عقیدت کے جذبے کے تحت مواد جمع کیا ہے اور حافظ کلام اقبال کی شخصیت وفن پیش کیا ہے۔ یقیناً ادبی حلقوں میں کتاب کی پذیرائی ہوگی۔

****

نذیر فتحپوری کا "ساحر شیوی کا تخلیقی منظر نامہ"

ڈاکٹر ستیہ پال آنند، کینیڈا

ساحر شیوی ایک ہمہ جہت اور نابغہ روزگار ادیب ہیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ نظم کی کوئی بھی صنف ان کے قلم کے دائرہ اختیار سے باہر نہیں ہے۔ غزل تو اردو کی مرکزی صنف سخت ہے اور اس میں طبع آزمائی ساحر شیوی صاحب نے ایک کہنہ مشق استاد کی طرح کی ہے، لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کوکن سے افریقہ کی فضاؤں میں اڑان کے بعد اور پھر وہاں سے انگلستان پہنچنے کے بعد بھی انہوں نے بقدر احسن و خوبی ان اصناف سخن میں بھی کمال فن حاصل کیا جنہوں نے گذشتہ تین دہائیوں سے اردو میں رواج پایا اور خال خال شاعر ہی ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان میں سے کچھ اصناف، مثلاً حمد و مناجات، نعتیہ شاعری، رباعی، قطعہ وغیرہ غزل اور پابند نظم کے دوش بدوش پروان چڑھی ہیں، لیکن جہاں دوہا، کہہ مکرنیاں، گیت اور تکونیاں ہندو شعری روایت کی پاسدار ہیں اور کچھ عرصے کے لیے بھلا دی گئی تھیں، وہاں سین ریوز اور ہائیکو "در آمدات سخن" ہیں اور تکونیاں، ثلاثیاں اور تلخیاں تازہ ترین ایجاد کردہ اصناف سخن ہیں اور ابھی رواج پانے اور اردو کی شعری روایت میں اپنی صحیح جگہ حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔

ساحر شیوی جیسے ہمہ جہت شاعر کو پرکھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ان جیسا ہی کوئی نقد و نظر کا ماہر ہو، جو ان سب اصناف سخن پر عبور نہ بھی رکھتا ہو تو بھی اس قابل ہو کہ اپنی تنقیدی اور تجرباتی تحریر میں ان سے انصاف کر سکے۔ کسی ایک کتاب پر تبصرہ لکھنا کوئی مشکل امر نہیں ہے، لیکن ساحر شیوی جیسے شاعر کی ہمہ جہتی جو چہار اطراف میں پھیلی ہوئی ہے، کو اپنی گرفت میں لے کر اس کی چھان بین کرنا ایک مشکل کام ہے۔

میرے خیال میں اس کام کے لیے نذیر فتح پوری صاحب سے بڑھ کر اور کوئی موزوں شخص نہیں ہوسکتا تھا۔ اس بات کا ثبوت ان کی کتاب ''ساحر شیوی کا تخلیقی منظر نامہ'' ہے جو اس وقت میرے سامنے ہے۔

نذیر فتح پوری 'گفت باہمی' میں لکھتے ہیں:

> ''ساحر شیوی محض ایک شاعر ہوتے یا صرف افسانہ نگار ہوتے اور کسی بھی صنفِ سخن کی فہرست میں اپنا نام پکی روشنائی سے تحریر کرنے کی حد تک ہی اپنی کوششوں کو رکھتے، تو ان کے فکر و فن پر اتنی اور ایسی گہرائی سے توجہ نہ دی جاتی، لیکن ساحر تو کسی اور ہی دنیا کے باشندے ہیں۔''

یہ نہیں کہ شخصیتوں پر لکھنے کے میدان میں نذیر فتح پوری ایک نو وارد ہیں۔ انہوں نے ایک درجن کے لگ بھگ ادبی شخصیتوں پر کتابیں لکھی ہیں اور اس میدان میں ان کا ثانی کوئی نہیں ہے۔ ان کا مطمحِ نظر صاف ہے، وہ لکھتے ہیں: ''فن کار کے فن کی داد دینا اس کو زندگی مہیا کرنے کے مترادف ہے۔'' اور اس خیال کے پیچھے ان کا فلسفۂ زندگی کارفرما ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں :

> ''آپ تصور کر سکتے ہیں جب کسی اور سے متعلق لکھنے کے لیے آپ آمادہ ہوتے ہیں تو سب سے پہلے اپنی انا اور خود پسندی کے بت کو کسی گہرے کنویں میں دفن کرنا پڑتا ہے۔ آپ قلم سے دوسروں کی تعریف کرنا اپنے نفس امارہ کو کچلنے کے مترادف ہے۔ یہ ایک طرح کا صوفیانہ عمل ہے جو کم از کم بندے کو بندے کے قریب کر دیتا ہے۔ ایک بندہ جب آپ کے حسن سلوک سے خوش ہوگا تو ظاہر ہے خدا بھی خوش ہوگا اور

یوں آپ کے لیے آپ کے قرطاس، قلم کی مشقت خدا کی
خوشنودی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔''

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب یا اس جیسی دیگر کتب لکھنے میں نذیر فتح پوری صاحب کی کوئی ذاتی غرض کارفرما نہیں تھی۔ وہ ایک فرض پورا کر رہے تھے جس کے لیے انہیں ان کا ضمیر اکسارہا تھا۔ گویا وہ ایک ایسا نیک کام کر رہے تھے جو خدمت خلق کے زمرے میں آتا ہے۔ تو آئیں، دیکھیں انہوں نے ساحر شیوی صاحب کی کون کون سی اصناف سخن کا جائزہ لیا ہے اور کیسے لیا ہے۔ ساحر شیوی ایک ایسے شاعر ہیں جن کے دل میں اللہ کے جلوے کا نور ہے۔ حمد ایک ایسی صنف ہے جس میں یہ نور ڈھل کر قاری کے دل کو بھی منور کر جاتا ہے۔ نذیر فتح پوری لکھتے ہیں: ''انسان کو ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرنے چاہیے...... اسی جذبے کے تحت حمد و مناجات کا ظہور عمل میں آیا۔ گویا اس کا اسلوب اور اس کی شکلیں جدا جدا ہو سکتی ہیں لیکن کیفیت ایک ہی ہے۔'' اس کے بعد وہ غزل کے فارمیٹ میں دوہے کی صنف میں، ماہیے کی طرز میں...... یعنی ہر سہ اصناف میں ساحر صاحب کے حمدیہ کلام کا جائزہ لیتے ہیں اور وہ بجا فرماتے ہیں کہ ''کوئی بھی صنف سخن ہو، ساحر اس میں حمد و ثنا کا پہلو پہلے نکالتے ہیں پھر اس کے بعد ہی واردات قلب کی گفتگو کرتے ہیں۔'' غزل کے یہ حمدیہ اشعار ساحر کے فن کی بخوبی ترجمانی کرتے ہیں۔

زمیں بھی تیری ہے اور آسماں بھی تیرا ہے
یہاں بھی راج ترا ہے وہاں بھی تیرا ہے
کسی بھی حال میں تو رکھ ہمیں گلہ کیوں ہو
جہاں بھی تیرا، نظام جہاں بھی تیرا ہے

اسی طرح دوہے کے فارمیٹ میں حمدیہ جذبہ جب ابھرتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے ہندو بھکتی بھاو اور مسلم طرز مناجات ایک دوسرے کے گلے مل گئے ہیں۔

ذرّے ذرّے میں اسے دیکھا ہے دن رات
ہر دم اس کے فضل کی ہوتی ہے برسات

بعینہ ماہیے کی طرز میں (جو کہ ایک گائی جانے والی صنف ہے) ساحر صاحب نے موسیقیت اور غنائیت کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔

جیسے ہو بہاروں میں　　پھولوں کی خوشبو میں　　اللہ کے ناموں میں

نعت ایک ایسی صنف سخن ہے، جس کے لیے نہ صرف سچے اور پاک جذبے کی ضرورت ہے، بلکہ عزت وعقیدت کے کچھ اور لوازمات بھی ہیں جنہیں پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔ ''با محمدؐ ہوشیار!'' یونہی نہیں کہا گیا۔ ساحر شیوی کے فن شعر گوئی کی اس جہت کے بارے میں نذیر فتح پوری لکھتے ہیں: ''ساحر نے چھوٹی چھوٹی بحروں میں، نہایت روانی کے ساتھ، پورے احترام کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے نبی کریمؐ کے اوصاف حمیدہ کو منظوم کرنے کی کوشش کی ہے۔

قابل احترام شاہ اممؐ
دو جہاں کے امام شاہ اممؐ

اور

فرشتوں نے بھی کی جس کی اطاعت
یہ رتبہ ہے امیر الانبیاؐ کا

ماہیے کی طرز سخن میں سیدھے سادے الفاظ میں اپنا جذبۂ عقیدت جیسے دوزانو ہو کر پیش کیا گیا ہے۔

سچائی کا پیکر ہیں　　شکل میں انساں کی　　اللہ کے دلبر ہیں

اور

گھر بار محمدؐ کا　　کاش میسر ہو　　دیدار محمدؐ کا

چونکہ ساحر ہر صنف سخن میں ید طولیٰ رکھتے ہیں، انہوں نے نعتیہ دوہے بھی کہے ہیں۔ نذیر صاحب صحیح فرماتے ہیں: ''مواد اور مفہوم کے ساتھ ان دوہوں کی روانی بھی داد کی مستحق ہے۔'' دو دوہے ملاحظہ فرمائیں۔

رحمت بن کر آئے جب نبیوں کے سردار
آپؐ کے دم سے بن گیا صحرا بھی گلزار

طیبہ میں دل ہے مرا، دنیا جانے خوب
میں عاشق سرکار کا، وہ میرے محبوب

نذیر فتح پوری صاحب کے ذوق انتخاب کی داد تو دینی ہی پڑتی ہے، ان کے مختلف اصناف سخن کے بارے میں اور ساحر کے ان اصناف میں حسن کارکردگی کے بارے میں ارشادات بھی خوب ہیں۔ ساحر شیوی کی غزلیات کے بارے میں لکھتے ہیں ''صاف گوئی کا برملا اظہار ان اشعار سے مترشح ہے۔ زندگی کی ان کڑی سچائیوں نے ساحر کی غزلوں کو نہ صرف یہ کہ جلا بخشی ہے بلکہ سرخ روئی بھی عطا کی ہے۔'' آج کی غزل تہہ داری کا جامہ اوڑھ چکی ہے اور اس کا اصلی چہرہ اس نقاب کے پیچھے کہیں چھپ گیا ہے، لیکن ساحر شیوی کی غزل کی خوبی ان کی غزلوں کا اسلوب ہے جو صراحت کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔ اصل موضوع اور مضمون کو پس پردہ رکھ کر صرف استعاروں اور اشاروں کی وساطت سے بات کہنا ان کا شیوہ نہیں ہے۔ اس لیے ان کے اشعار سیدھے دل تک پہنچتے ہیں۔ نذیر فتح پوری صاحب نے نہ صرف اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے، بلکہ ان کے اشعار نموتاً بھی پیش کیے ہیں۔ پوربی لب و لہجے میں یہ اشعار دل کو اپنے سہل ممتنع سے چھوتے ہیں۔

پل پل آنکھیں چار کرو ہو   مجھ سے کتنا پیار کرو ہو

جینا بھی آسان نہیں تھا مرنا بھی دشوار کرو ہو

یہ اشعار بھی اپنی سادگی اور نفاست سے قاری کے دل میں گھر کر لیتے ہیں

اپنی زباں سے کیا کہوں کیسی ہے میری ذات
سورج کے شہر میں کبھی ہوتی نہیں ہے رات

اک خون کیا ہوا کہ پریشاں ہے سارا گاؤں
ہر لمحہ ایسے ہوتے ہیں شہروں میں حادثات

یہ انداز بھی اپنی شوخی اور تازگی کے سبب سے لوح دل پر لکھے جانے کے قابل ہے

اس گلی میں جائیں تو سب کچھ گنوا کر آئیں گے
ہوش کی چل کر نہ کیوں پہلے خریداری کریں

ایسا نہیں ہے کہ ساحر شیوی صاحب کے سب اشعار اپنی شفاف صراحت کی وجہ سے براہ راست قاری تک پہنچتے ہیں۔ انہیں استعارات، تشبیہات اور علامت نگاری کا ہنر بھی خوب آتا ہے۔ مختلف غزلوں کے کچھ اشعار جو مجھے پسند آئے، میں لکھ رہا ہوں

☆ ایک سودا سا میرے سر میں ہے کوئی بیگانہ جیسے گھر میں ہے
☆ لہو لہو ہے بدن کسی کا گواہ ہے پیرہن کسی کا
☆ زندگی میں اگر مگر تو ہو آدمی صاحب نظر تو ہو

گویا اک جہان صد رنگ آباد ہے، جس میں پھول ہیں، ستارے ہیں، کہکشاں ہے، دھنک ہے اور وہ سب رنگ موجود ہیں جو کلاسیکی غزل اپنی روایت کے طور پر ہمیں ودیعت کر گئی ہے۔ فرق صرف بات سیدھے سادے اور براہ راست طریقے سے کہنے کا ہے، جس میں ساحر مشاق ہیں۔

راقم الحروف کو دوہا نگاری کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے، لیکن ہمیں یقین کرنا پڑتا ہے، جب وزیر آغا جیسے جید اسکالر یہ کہتے ہیں: ''دوہے کا اپنا ایک کلچر ہے جو اس

برصغیر کے ہزاروں برس پر پھیلے ہوئے ماضی کا ثمرہ بھی ہے اور مظہر بھی ۔ شاید ہی کوئی شعری صنف بیک وقت اتنی رجعت پسند اور جدیدیت نواز ہو جتنی کہ دوہے کی صنف جو اپنے قدیم لہجہ اور مزاج کو خود میں سمونے پر ہمہ وقت مستعد دکھائی دیتی ہے۔'' نذیر فتح پوری صاحب درست فرماتے ہیں، '' زبان، بیان، متن، مواد اور اوزان کے لحاظ سے دوہا اب پوری طرح اردو شاعری کا حصہ بن چکا ہے۔''

ساحر صاحب کے دوہے بھی ایسے ہی دل کو چھوتے ہیں جیسے کے ان کے غزلیہ اشعار۔ اس کی وجہ ان کی صراحت ہے جو ایک شیشے کی طرح چمکتی ہے۔ وہ اپنے بارے میں درست ہی کہتے ہیں۔

ساحرؔ میرا ذہن ہے پانی جیسا صاف
ہر دم اس کو پاؤ گے شیشے سا شفاف

اردو کے بارے میں ان کے دوہے اپنی مثال آپ ہیں :

اردو بھارت ورش میں پل کر ہوئی جوان
سچ مچ میرے دیش کی اردو ہے پہچان

اردو بھاشا کا یہاں گھر گھر ہے پر چار
لندن مرکز تیسرا ، اردو کا ہے یار

اور لندن کی بات جب آتی ہے تو انہیں لندن سے بھی ایک عاشق کی سی محبت ہے۔

لندن ایسا شہر ہے جس کا ہر اتوار
کرتا چھ دن بعد ہے روحوں کو بیدار

یہ سپنوں کا شہر ہے لندن جس کا نام
سبز پری سی ناریاں ، اندر سا گلفام

نذیرؔ فتح پوری ساحرؔ صاحب کی دوہانگاری کے بارے میں یوں sum

up کرتے ہیں۔

''ان کے بعض دوہوں میں نفسیاتی کیفیت کو بہت ہی سلیقے اور دردمندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ بعض دوہے مستی اور سرشاری کا احساس جگاتے ہیں...... پند و نصیحت دوہے کا بنیادی وصف ہے، صوفی سنتوں نے عوام کو راہ پر لانے کے لیے دوہے کو وسیلہ بنایا ہے، ساحرؔ چونکہ روایتوں سے جڑے ہوئے فن کار ہیں۔ ان کے اندر کہیں نہ کہیں ایک صوفی محوِ استراحت ہے، جب وہ آنکھیں کھولتا ہے تو ساحرؔ سے (پند و نصیحت کے) دوہے کہلواتا ہے۔''

دیگر باز یافت یا درآمدات کے قبیل کی اصناف سخن پر لکھنے کے لیے میں خود کو نااہل پاتا ہوں اس لیے جو کچھ نذیر فتح پوری صاحب نے لکھا ہے، وہ اپنے آپ میں ایک سند ہے لیکن رباعی کی صنف کے بارے میں مجھے کچھ کہنا ہے۔ رباعی ایک مشکل صنف سخن اس لیے نہیں ہے کہ عروض کا پل صراط طے کرتے ہوئے شاعر کے پاؤں متزلزل ہو سکتے ہیں، بلکہ اس لیے ہے کہ بہت سے رباعی گو شاعر پہلے دو مصرعوں کو صرف اس لیے موزوں کرتے ہیں کہ آخری دو مصرعے نہ صرف بخوبی مقفیٰ ہو سکیں بلکہ ان میں ایک انجانی سی حیرت کا تاثر بھی ہو اور یہ نہیں دیکھتے کہ آیا پہلے دو مصارع موضوع، مضمون اور متن میں ہم آہنگی بھی برقرار رکھ سکتے ہیں کہ نہیں۔ ساحرؔ کی رباعیات اس عیب سے پاک ہیں۔ کچھ نمونے جو نذیرؔ صاحب نے پیش کیے ہیں، حسب ذیل ہیں۔

پتّوں سا بکھر رہا ہے عالم سارا
پت جھڑ سا گزر رہا ہے عالم سارا
انجام کی کچھ خبر نہیں ہے اس کو
بے موت سا مر رہا ہے عالم سارا

اس رباعی میں پتوں کا بکھرنا، پت جھڑ سا گزرنا اور انجام کی خبر نہ رکھتے ہوئے

بے موت سا مرنا، استعاراتی سطح پر موسم کی موت اور انسان کی موت کو ہم آہنگ کرتا ہے۔ پتوں سا بکھرنا اور حواس خمسہ کا بکھرنا استعارے کے دو پہلو ہیں، جنہیں شاعر نے بخوبی پیش کیا ہے۔ چاروں مصرعے مربوط ہیں۔صرف ایک رباعی اور پیش کر کے اپنا مدعا واضح کروں گا۔

گھنگھور گھٹاؤں کو درخشاں کر دے
صحراؤں کو رنگین گلستاں کر دے
آنکھوں سے پلا، یا مجھے پیمانوں سے
ساقی مرے جینے کا بھی ساماں کر دے

بادی النظر میں یہ ایک گھسا پٹا مضمون ہے لیکن یہ شاعر کے قلم کی خوبی ہے کہ اس نے اس میں بھی استعاراتی سطح پر ندرت پیدا کی ہے۔ پہلے دو مصرے ایک بصری منظر پیش کرتے ہیں۔ دوسرے دو مصرے اس منظر کو خود سے مشابہ کر کے استعارے کی تکمیل کر دیتے ہیں ''میں'' یعنی شاعر کا واحد متکلم، ایک صحرا کی طرح پیاسا ہے، اسے وہ جام ارغواں چاہیے جو ساقی کے پاس ہے، اب یہ ساقی کی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ آنکھوں سے پلائے یا پیمانے سے! بہرحال پہلے دو مصرعے مقناطیس کی طرح آخری دو مصرعوں سے استعاراتی سطح پر جڑے ہوئے ہیں۔

نذیر فتح پوری صاحب بے حد انکساری سے اس کتاب کے دیباچے میں یہ اعتراف کرتے ہیں کہ وہ نہ ہی تو ناقد ہیں نہ مبصر اور ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے انہوں نے اپنے علم اور اپنی تفہیم کے مطابق ساحر شیوی کے تخلیقی منظر نامے کو مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے صرف یہی کہنا ہے کہ اس کتاب کے مطالعے کے بعد انہیں ایک اعلیٰ درجے کا ناقد اور مبصر کہلوائے جانے کا حق حاصل ہے۔

****

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
ڈاکٹر نذیر فتح پوری کے آئینے میں

رفیق شاہین

نذیرؔ فتح پوری کی کتاب ''مناظر عاشق ہرگانوی اور ژرف گوئی'' جو سال رواں میں عالمی منظرنامے پر طشت از بام ہو کر اُن کی عظمت و وقعت، عزت و رفعت اور شہرت و شہامت میں اضافے کا سبب بنی ہوئی ہے، اصلاً اور واقعتاً اکتاب کا معرضِ وجود میں آنا، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی کتاب ''ژرف گوئی'' پر اُن کے انفرادی ردعمل کا نتیجہ ہے۔

اب اگر اُن کا یہ ردعمل مثبت ہے، خواشگوار ہے اور اس سے قبلہ ہرگانوی کی تعریف و توصیف کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں تو اس جرم صداقت کی پاداش میں انہیں غزل کی طرح لائق گردن زدنی تو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ویسے بھی اچھے کو اچھا اور نیک کو نیک نہ کہنا بھی کفر کے مترادف ہے اور ناقابل تردید حقیقت تو ہے بھی یہی کہ مناظر عاشق ہرگانوی، عتیق احمد عتیق، نذیر فتحپوری، سعید رحمانی اور ڈاکٹر محبوب راہی انانیت، رعونت، تمکنت، کدورت اور غرور و تکبر سے پاک و صاف ایسی وسیع النظر، وسیع القلب، دریا دل دردمند، دلنواز زخموں پر مرہم رکھنے، خوشیاں بانٹنے اور سب کو ساتھ لے کر چلنے والی ہستیاں ہیں جن کی انسان دوستی اور انسانیت نوازی کی قسمیں کھائی جا سکتی ہیں۔ علاوہ ازیں بحیثیت قلمکار و فنکار انہوں نے میدان ادب میں معرکہ آرائیوں کے جوہر دکھا کر جو فتحیابیاں، کامیابیاں، کامرانیاں اور ظفریابیاں حاصل کی

ہیں اور جس طرح اپنے تخلیقی عمل کی فعالیت سے ادب کو مالا مال کیا ہے اس سے اُن کی اکملیت اور انفرادیت، عظمت وفضلیت، منصب وحیثیت اور وقعت و درفعت خود ہی مترشح اور آشکار ہو جاتی ہے۔ سبھی نے میری اعانت واستعانت فرمائی ہے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ میرے شعری مموعے ''بادبان سفینوں کے'' پر مناظر عاشق ہرگانوی اور ڈاکٹر محبوب راہی جیسے بلند پایہ اور مصروف مشاہیر تاثرات لکھنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے مگر انہوں نے تاثرات بھیج کر مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ مناظر عاشق صاحب کی مجھ سے بھی زائد کرم فرمائیاں، عنایات ونوازشات اور احسانات نذیر فتح پوری پر رہیں کہ وہ بذریعے ترسیل واشاعت منزل مقصود کے سفر میں انہیں بھی اپنے ساتھ لے کر چلے اور احساس کمتری کے خول سے انہیں باہر نکال کر اُن میں خوداعتمادی کی قوت وتوانائی پیدا کی۔ اور چونکہ ہر شریف النفس انسان نیکی کا جواب نیکی سے عملاً دینے کا شدید جذبہ اپنے دل میں رکھتا ہے۔ یہی جذبہ مدت مدید سے اُن کی (نذیر صاحب کی) چٹکیاں لے کرانہیں اپنے تکملے کے لیے اکسارہا تھا جس سے عاجز آخر مالی مسائل کے باوجود وہ اپنی اس کتاب کے اجراء کے ذریعے اپنی دلی عقیدتیں اور محبتیں اپنے محسن وکرم فرما مناظر عاشق ہرگانوی تک پہچانے میں کامیاب وظفریاب ہو ہی گئے۔

ڈاکٹر نذیر فتح پوری کی یہ کتاب ''مناظر عاشق ہرگانوی اور ژرف گوئی'' ۶۸ صفحات کومحیط رنگین سرورق اور روشن کتابت وطباعت سے آراستہ نیز مجلد ایک ایسی نظر افروز و دل پذیر اور خوبصورت کتاب ہے جو والہانہ طور پر اپنی طرف مائل کر لیتی ہے۔

کتاب کا انتساب کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی سے منسوب ہے۔ گفتِ باہمی کے علاوہ کتاب کو سات عنوانات کے ساتھ سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) مجھے پیارا ہے وہ جس کو کتابوں سے محبت ہے۔ (۲) ''اسباق'' کا اداریہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے نام (۳) تضمین بر آزاد غزل مناظر عاشق ہرگانوی (۴) منظوم ''مناظر نامہ'' پر منظوم تبصرہ۔ (۵) اسباق خطوط اور ہرگانوی (۶) مناظر بنام نذیر۔ چند خطوط (۷) ژرف گوئی، تجزیاتی مطالعہ

گفت باہمی کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے نذیر صاحب کے صحن میں دو آم کے پیڑ ہیں۔ ان پر پھل بھی آتے ہیں یہ تو انہوں نے نہیں لکھا مگر یہ ضرور لکھا ہے کہ علی الصبح اسی صحن میں نشست جما کر انہوں نے جہاں آم کی شاخوں پر حمد و ثنا کرتی چڑیوں کے سریلے نغموں سے لطف و سرور حاصل کیا ہے، نسیم صبح گاہی کے مزے لوٹے ہیں وہیں انہوں نے صرف آٹھ دن میں یہ کتاب مکمل کی ہے۔ الحمدللہ!

پہلا باب مناظر عاشق کی کتب عاشق (کہ وہ ۱۲۲ر کتب کے مصنف و مولف ہیں) کی منظوم تعریف و توصیف پر مبنی ہے۔ نذیر فتحپوری کو خود بھی کتابوں سے محبت ہے اسلیے انہوں نے نظم میں کتابوں کی عظمت و اہمیت پر ہی زیادہ زور قلم صرف کیا ہے ؎

کتابیں ماں کی ممتا ہیں، کتابیں باپ کا سایہ
کتابوں سے زیادہ کچھ نہیں ہے اپنا سرمایہ
سکوں دل کو عطا کرتی ہیں یہ بے جان جذبوں کو
حقیقت میں بدلتی ہیں یہی انساں کے خوابوں کو

ستمبر ۲۰۰۳ء کے اسباق میں مناظر عاشق ہرگانوی پر جو عظیم و ضخیم اور رفیع و وقیع گوشہ شائع کیا گیا تھا اس میں ہرگانوی سے منسوب اداریہ نذیر فتح پور نے منظوم پیش کیا تھا وہی منظوم اداریہ دوسرے باب کے طور پر اس کتاب میں دہرایا گیا ہے۔

نظم کی آخری سطریں ہرگانوی کے سیاق وسباق میں ملاحظہ فرمائیں ؎

''وہ گھنی چاؤں کا پیڑ ایسا ثمر بار ہے/ چھین کر ساعتیں رنج کی، کرب کی/ خود بھی زندہ ہے اوروں کو بھی دے رہا ہے حیاتِ دِوام/ اس لیے چند صفحے کتاب ادب کے میرے/ اس کی شاداب خوشبو سے منسوب ہیں۔''

قبلہ ہرگانوی کی آزادغزل پرنذیر فتح پوری کی تضمین تیسرے باب کا حصہ بنی ہے۔ آزادغزل پر پہلی اور آخری تضمین کا بھی سہرا نذیر فتحپوری کے سر بندھا ہے۔ اچھی تضمین وہی مانی جاتی ہے جس میں تضمین نگار شاعر کے خیال سے خیال لفظ سے لفظ لہجے سے لہجہ اور اسلوب سے اسلوب کچھ اس طرح ہم آہنگ کرتا ہے کہ دو تحریں شیر وشکر ہو کر ایک ہی شاعر کی معلوم ہوں۔ ذیل کے دو شعروں میں نذیر فتحپوری نے اپنی فنکارانہ چابکدستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جس خوبی سے لفظیات کے مزاج کے مطابق لفظوں کو لفظوں سے اور خیال کو خیال ے ہم آہنگ کیا ہے اس کی داد دیتے ہی بنتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے ؎

(۱) مجھ پر اک دن ایسی ساعت آئی تھی
جان بہت گھبرائی تھی
زخمی تھی گیتوں کی سرگم، سوز بھری شہنائی تھی
''جانے کیسا ساز چھڑا تھا، رت تھی اور پروائی تھی
میں تھا اور تنہائی تھی۔''

(۲) شبنم کی برسات نے منہ کی کھائی تھی
سورج کی یلغار نے چاروں جانب دھوم مچائی تھی
کرن کرن ہرجائی تھی

''جلتی دھرتی کی چھاتی پر اک پیاسی انگڑائی تھی
آوارہ آکاش پہ کس نے چادر سی پھیلائی تھی''

چوتھے باب کو انہوں نے اپنے منظوم تبصرے کے لیے وقف کیا ہے۔ان کا یہ منظوم تبصرہ ڈاکٹر عبدالمناف طرزی کی منظوم کتاب ''منظر نامہ'' پر ہے جو اسباق کی زینت بن چکا ہے۔ملحوظ رہے کہ طرزی کے یہ اشعار ہرگانوی سے منسوب ہیں۔نذیر فتحپوری کی اختراع ہے جو ان کی قادر الکلامی پر مدلل ہے۔ یہ دو لفظ خدمتوں اور چاہتوں قابل غور ہیں۔

پانچویں باب کو نذیر صاحب نے اسباق ، کمہار ، مناظر صاحب کی کرم فرمائیوں اور اُن سے اپنے تعلقات کی نوعیت کے اظہار کے لیے مختص کیا ہے۔اس باب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسباق پہلی بار مئی ۱۹۸۱ء میں منظر عام پر آیا تھا اور ہرگانوی صاحب کا کہسار اس سے بھی پہلے ۱۹۷۸ء سے شائع ہوتا چلا آرہا ہے۔نذیر صاحب کی تخلیقات کی باقاعدہ اشاعت کا آغاز بقول اُن کے ''کمہار'' سے ہی ہوا تھا۔انہوں نے جہاں مناظر صاحب کی والدہ محترمہ کے سانحہ ارتحال پر اُن کے رنج وملال کا ذکر کیا ہے وہیں انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ انہوں نے اپنی ماں کی زندگی پر اور ماں پر تین کتابیں تصنیف فرما کر ادب میں ماتائیہ ادب کی داغ بیل ڈال دی۔کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جاوید اختر کے اس مقبول عام فلمی مکالمے کی ''میرے پاس ماں ہے'' نے بھی شعراء کو اس موضوع کی اہمیت کا احساس دلایا ہے۔نذیر فتحپوری نے ان کی نوازشات وعنایات اور اُن کی معاونت واستعانت کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔اور یہ بات ہے بھی سچ کہ ہرگانوی صاحب بڑے ہی وسیع القلب اور دریادل انسان واقع ہوئے ہیں۔وہ جن نئے لوگوں میں کچھ کرنے کی لگن

پاتے ہیں انھیں اپنا طالب علم مان کر انہیں آگے بڑھنے کے لیے مواقع فراہم کیا کرتے ہیں۔ انہوں نے نذیر فتحپوری کی صلاحیتوں کو بھانپ لیا تھا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے نذیر تحپوری سے تکونیاں اور کہہ مکرانیاں لکھوا کر اُن کی تخلیقات کو اپنی اہم کتابوں میں جگہ دی۔ ان کی کرم فرمائیاں ناچیز پر بھی رہی ہیں اور انہوں نے اپنی کئی اہم اور تاریخ ساز کتابوں پر خاکسار کی تخلیقات شائع فرما کر مجھے اس لائق بنا دیا کہ ادب کی یگانہ روزگار ہستیاں اپنی کتابوں کا دیباچہ مجھ سے لکھوانے کی خواہشمند نظر آتی ہیں اور طرز تحریر کو سراہتی بھی ہیں۔ مناظر عاشق ہرگانوی بیسویں اور اکیسویں صدی کی ایک ایسی عبقری، نابغہ یگانہ روزگار اور عہد ساز شخصیت ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں۔ وہ خود کو منظم کر کے ۱۲۲ رکتابیں لکھنے کے علاوہ وہ اور بھی بہت سے ادبی کام جس باقاعدگی اور مستقل مزاجی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں یہ انہیں کا کام ہے۔ خدا نے انہیں وہ خداداد صلاحیت عطا کی ہے کہ جو کام دس بیس لوگ بھی نہیں کر سکتے وہ تن تنہا انجام دے رہے ہیں۔ اگر کسی عامیانہ صلاحیت کے کسی شخص پر اتنا بوجھ لاد دیا جائے تو مجھے یقین واثق ہے کہ اُس کی ریڑھ کی ہڈی بھی ٹوٹ جائے گی اور وہ پاگل بھی ضرور ہو جائے گا۔ وہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ (T.S. ELLIOT) کے ہم خیال ہیں۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کا کہنا ہے کہ ''ادب میں نئے تجربوں کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے تا کہ ادب کے سرمایے میں اضافہ ہوتا رہے۔'' ہرگانوی صاحب نے نئی اور پرانی بہت سی اصناف کی رگوں میں لہو دوڑا کر اُن میں جس طرح روح پھونکی ہے اُس سے بھی واقف ہیں ہرگانوی صاحب نے ہر صنف سخن کا استقبال کرنے میں ہمیشہ ہی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہائیکو ماہیا، ثلاثی، آزاد غزل، دوہا غزل، دوہاگی، کہہ مکرانی، تکونی، ترائیلہ اور سانیٹ جیسی تمام اصناف کو نہ صرف انہوں نے گلے لگایا ہے

بلکہ اُن کے احیا و ترویج میں اہم عملی کردار بھی نبھایا ہے۔ نذیر فتح پوری نے اُن کی ایسی ہی نہ جانے کتنی خصوصیات کی روشنی میں اگر اُن کو خراج تحسین ادا کیا ہے تو کچھ غلط نہیں کیا بلکہ اچھا ہی کیا ہے کہ مناظر عاشق ہرگانوی ہیں بھی اسی کے مستحق کہ ادب کی خاطر انہوں نے اپنی زندگی کی روزمرہ کی عام خوشیوں کو تیاگ کر بہت بڑی قربانی دی ہے۔ نذیر صاحب نے اُن سے منسوب ہرگانوی صاحب کے خطوط کے کچھ اقتباسات بھی شائع فرمائے ہیں جو مناظر صاحب کے اُن سے ہمدردانہ سلوک اور اُن کی کرم فرمائیوں کے مظہر ہیں۔ علاوہ ازیں مناظر صاحب کا اسباق میں گوشہ شائع ہونے پر جو بہت سے خطوط گوشے کی تعریف میں انہیں موصول ہوئے تھے انہوں نے ان کا انتخاب بھی اس باب میں شامل کر دیا ہے۔

چھٹویں باب میں انہوں نے مناظر صاحب کے وہ خطوط بھی شامل کتاب کیے ہیں جو نذیر صاحب سے منسوب ہیں۔ یہ عام قسم کے رسمی سے خطوط ہیں مگر ان سے باہمی مراسم کا پتہ چلتا ہے۔

کتاب کا ساتواں اور آخری باب ژرف گوئی۔ تجرباتی مطالعہ سب سے اہم باب ہے جو مناظر صاحب کی کتاب ''ژرف گوئی'' پر مبنی ہے۔ یہ کتاب مناظر صاحب کی دیانت وفطانت اختراعی سرشت وقوت اور اُن کی ذہنی تخلیقی اپج کا اپنے آپ میں ایک ثبوت ہے کہ انہوں نے ایک عجیب اور انوکھا کام یہ کیا کہ قلمکار فنکاروں کو دو سوال بھیج کر اُن سے جواب لکھ بھیجنے کی درخواست کی جس کے نتیجے میں انھیں جو جوابات موصول ہوئے مناظر صاحب نے ان سے ایک کتاب مرتب کر کے شائع فرما دی اور اس طرح سب سے انوکھی اور متنوع ومنفرد کتاب معرض وجود میں آ گئی جو رنگا رنگی اور بوقلمونئی میں اپنی مثال آپ ہے۔ مناظر صاحب نے جو دو سوال

اہالیان قلم کے سامنے رکھے وہ تھے ''یہ سال ۲۰۰۸ء آپ کے لیے ادبی طور پر کیسا گزرا؟'' اور دوسرا سوال تھا ''اس سال کا آخری دن آپ کیسے گزارنا چاہتے ہیں؟'' تھوڑے ہی عرصے میں درجنوں قلمکاروں کے جوابات موصول ہوئے جو رنگا رنگ اور جدا جدا جہات کے آئینہ دار ہیں۔ کسی نے سوالات کو عمومی نوعیت کا سمجھ کر عام سے جواب لکھ دیے تو کسی نے سوالات کی گہرائی میں جا کر اپنی ذات اور حیات و کائنات کے فلسفے اور اپنے روزمرہ کے معمولات کو بھی اپنے جوابات کے حصار میں سمیٹ لیا۔ کسی کو اپنی سال بھر کی کارگزاریوں کی لن ترانی کا موقعہ ہاتھ آ گیا تو کوئی مذکورہ برس حاصل شدہ فتحیابیوں کے نشے میں مخمور نظر آیا کوئی ایک نے جوابات کے طشت میں مذکورہ سال کے دیے زخموں کو سجا کر پیش کر دیا۔ جی تو چاہتا ہے کہ سبھی کے جوابات کے اقتباسات پیش کروں مگر جوابات لکھنے والوں کے ناموں کی فہرست ہی اتنی طویل ہے کہ اس مختصر مضمون میں اُن سب کے نام پیش کرنے کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ قارئین نذیر فتحپوری کی مرتبہ کتاب ''مناظر عاشق ہرگانوی اور ژرف گوئی'' کا مطالعہ خود کریں۔

****

ڈاکٹر ودّیا ساگر آنند کا تخلیقی منظر نامہ، پر ایک تاثر

محب الرحمٰن وفا

ڈاکٹر ودّیا ساگر آنند جیسی اردو دوست، بلند وسیع فکر کی مالک اور عظیم الشان اہمیت کی حامل شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ موصوف نہ صرف اردو کے کہنہ مشق شاعر اور خوش فکر ادیب ہیں بلکہ افریقی اور برطانوی گلڈ کے سرپرست بھی ہیں جس کی جانب سے ڈاکٹر ساحر شیوی جیسے اہل نقد و بصیرت کی نگہداشت میں ''پرواز'' لندن، ''سفیر اردو'' کراچی، ''ماہیا روپ کراچی'' اور ''ترسیل'' جے پور جیسے اردو ادب کے وقیع اور معیاری رسائل شائع ہوتے ہیں۔ آپ لندن پارلیمنٹ کے رکن بھی ہیں۔

بقول نذیر فتح پوری صاحب ''آپ نے اردو زبان اور اردو سماج کو جتنا پیار دیا ہے اس کے عوض ان کو بھی اتنا ہی پیار ملا ہے۔ یہ پیار سکوں کی جھنکار کا مرہون منت تو نہیں البتہ لفظوں کے ہیرے جواہرات سے انکا دامن بھر دیا گیا ہے۔'' محترم نذیر فتحپوری صاحب نے ڈاکٹر ساحر شیوی کے برادرانہ حکم پر اپنی ذہنی اور علمی توانائی صرف کر کے، ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کا عمیق مطالعہ کر کے، آپ کے فکر و فن کے ساگر میں غوطے لگا کر فن کے بیش بہا موتی تلاش کیے ہیں۔ ''ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کا تخلیقی منظر نامہ جیسی گراں قدر ادبی دستاویز تصنیف کی ہے۔ موصوف کے فکر و فن پر تصنیف شدہ بیش بہا سرمائے میں مزید اضافہ کیا ہے۔ ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کے فکر و فن کو موضوع بنا کر موصوف کے متعدد پہلوؤں کی بڑے ہی دل نشین اسلوب میں مزید وضاحت و تشریح کی ہے۔

نذیر فتح پوری صاحب نے اپنی اس ادبی کاوش کا انتساب مرحوم معین الدین شاہ کی روح کے نام کیا ہے ڈاکٹر ودیا ساگر آنند جن کی دریافت ہیں۔

اپنی گفت باہمی میں نذیر صاحب نے محترم کالی داس گپتا رضا مرحوم جیسے عظیم فنکار کی اردو کے ساتھ روحانی نسبت کا بھی تذکرہ کرتے ہوئے ان کی اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ وہ اردو کے ہندو شعراء پر از سر نو کام کرنے کے خواہاں تھے۔ ان کی اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے نذیر فتح پوری صاحب نے ''اسباق'' کا وہ شمارہ جس میں برادرم دیپک بدکی کے فکروفن پر گوشہ شائع کیا تھا ہندو اہلِ قلم کے لیے مختص کر دیا تھا۔ اپنی اس گراں قدر کاوش کو نذیر صاحب ''قطرہ بھر'' گردانتے ہیں جو آپ کے قلندرانہ مزاج کی ترجمانی ہے۔ نذیر صاحب نے اپنی اس کاوش سے روحانی مسرت حاصل کی ہے۔

''ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کا تخلیقی منظر نامہ'' میں محترم نذیر فتح پوری نے موصوف کی شخصیت اور فن کی متعدد پہلوؤں کو پانچ ابواب میں تقسیم کر کے ہر ایک پہلو کا بڑی ہی گہرائی اور گیرائی سے جائزہ لیا ہے۔ پہلا باب ''شخصیت'' کا آغاز نذیر صاحب نے ''اردو کے ہندو شیدائی'' اس عنوان سے کیا ہے۔ آپ نے اس باب میں ہماری پیاری اردو زبان (جو اس ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے) سے دلچسپی اور تعلق رکھنے والے غیر مسلم شعراء اور ادیبوں کی اردو محبتوں اور ادبی خدمات کو جس خوش اسلوبی سے سراہا ہے وہ نذیر صاحب کی قلمی دیانت، حسنِ نظر اور انصاف پسند طبع کی ترجمان ہے۔

یہ اظہر من الشمس ہے کہ تقسیم ملک کے افسوس ناک سانحے کے بعد سے تا حال چند شر پسند عناصر اور متعصب ذہن، ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بدگمانیاں پیدا کرنے کے لیے حتیٰ المقدور کوششیں کر رہے ہیں۔ ان کی یہ پر تعصب کاوشیں نہ صرف ہماری پیاری اردو زبان بلکہ گنگا جمنی تہذیب کے کئی روشن پہلوؤں کے ساتھ زیادتی اور ظلم ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ آج بھی متعدد شخصیات ایسی ہیں جو نفرت کی ان آندھیوں کے درمیان بھی مشعلِ اردو بڑی جانفشانی سے اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے ہیں۔ پورے اخلاص کے ساتھ شجر اردو کی آبیاری میں ہمہ وقت مصروف ہیں۔

ان تمام عاشقانِ اردو کی گراں قدر کاوشیں اس خوبصورت زبان کی زرخیزی کا باعث ثابت ہو رہی ہیں۔ ان میں ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کا نام سرفہرست ہے۔ بقول نذیر فتحپوری صاحب موصوف کرم یوگی ہیں جن سے ہمیں بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ عملی جدوجہد کے پیکر ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کا مطالعہ اندھیروں میں چراغ کا کام کرتا ہے۔ راقم الحروف کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے۔

یاسیت کی تیرہ شب میں رہگذر امید کی
جگنوؤں کی جگمگاہٹ سے منور ہوگئی

(راقم)

نذیر صاحب نے مزید یہ بھی وضاحت کی ہے کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جیسی علمی اور پرخلوص شخصیت ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کی شائستگی و شرافت، مہمان نوازی اور اردو زبان وادب سے ان کی بے پناہ محبت سے بے حد متاثر ہیں اور بقول گوپی چند نارنگ ''ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کی شاعری اور نثر میں بھی یہی سرشاری، محبت اور اخلاص جگہ جگہ نمایاں ہے۔''

دوسرا باب نذیر صاحب نے ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کی شاعری کے لیے مختص کیا ہے۔ موصوف کی شاعری پر ہر ایک زاویے سے سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ جہاں آپ کی حمد و مناجات کی فصاحت و بلاغت کو سراہا ہے وہیں موصوف کی نعت گوئی اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبتوں کا ذکر کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ آپ نے ہندو ہوتے ہوئے بھی اسلامی عقیدے کا بڑا خیال رکھا ہے۔ بطور حوالہ موصوف کی نعت پاک سے خوبصورت اشعار کا انتخاب کیا ہے جن میں چند ملاحظہ کیجیے۔

آسمانوں سے بھی جو بار اُٹھایا نہ گیا
اور ملائک سے بھی جو راز سنبھالا نہ گیا
تب خداوند نے قرآن تمہیںؐ سونپ دیا

تم کو پیغامبری کے لیے معمور کیا
آپ پہنچائیں یہ فرمانِ الٰہی گھر گھر
اس کی خلقت نہ بھٹکتی پھرے یوں در در
جلوہ توحید کا انساں کو دکھایا تم نے
اس سے ملنے کا صحیح رستہ دکھایا تم نے

موصوف کے مجموعہ کلام ''مۓ آنند'' کلام نرم و نازک'' اور متعدد تخلیقات کے تجزیہ سے نذیر صاحب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ''ڈاکٹر و دیا ساگر آنند اپنی شاعری میں ایک مخلص انسان، سچے شاعر، ایک بے باک مبصر، ایک بے لاگ صحافی، ایک جیالے فن کار اور وسیع المشرب سوچ کے مالک نظر آتے ہیں۔ وہ ہندو ہیں یا مسلمان یہ بعد کی بات ہے پہلے وہ ایک انسان ہیں۔ ایک ایسا انسان جو خدا سے ڈرتا ہے اور خدا کے بندوں سے پیار کرتا ہے۔ آنند اردو شاعر ہیں اس لیے وہ محبتوں کے شاعر ہیں۔ یکجہتی کے علم بردار ہیں۔ بھائی چارے کے ضامن ہیں۔ نیکی کا علم ان کی روئیں روئیں سے پھوٹتا ہے یہی ان کی عبادت ہے، یہی ان کی ارچنا ہے۔ اسی لیے وہ نفرت کے پجاریوں کے خلاف خدا سے ارچنا کرتے ہیں

یارب یہ تری پوجا بندے سے لڑے بندہ
میں ایسی پرستش سے باز آیا خدا وندا

نذیر فتح پوری صاحب کا یہ قول سو فیصد صحیح ہے کہ ''تخلیق فنکار کے ذہن و فکر کی غماز ہوتی ہے۔ کسی کو دیکھنا ہو تو اس کی تحریروں کو دیکھو'' نذیر صاحب نے موصوف کا منظر نامہ تخلیقی منظر نامہ تحریر کرنے کے لیے آپ کی شاعری کا بڑ گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کر کے اپنے نتائج اخذ کیے ہیں۔ ''موصوف کی شاعری میں وطن کا تصور بھی بڑی خوبصورتی سے تراشہ ہوا مضمون ہے۔ نذیر صاحب یوں رقم طراز ہیں کہ ڈاکٹر و دیا ساگر

آنند کولندن میں کون سا عیش، کون سی راحت اور کون سی طمانت میسر نہیں ہے مگر پھر بھی وہ اپنے ملک، اپنے وطن کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔ اس کے اچھے برے حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں اور اسے اپنا مرکز فکر بنا کر، یہاں کے ادب، سیاست، غربت اور زندگی کے دیگر شعبوں میں کروٹ لیتی ہوئی بے یقینی اور پرورش پاتی ہوئی بے چینی کو الفاظ کے پیکر میں ڈھال کر اپنی حساسیت اور وطن پرستی کا ثبوت اس طرح فراہم کرتے ہیں۔

وطن کے خار کو بھی چوم لوں میں
وطن کا نام آیا ہے زباں پر

اسی باب میں نذیر صاحب نے ڈاکٹر ودیا ساگر آنند جیسے کاروان غزل کے مسافر کی شاعری میں اردو کے حوالے اور متعدد روشن پہلو تلاش کر کے موصوف کی اردو محبتوں کے دامن کو اپنے خوبصورت الفاظ اور زرین خیالات کے بیش بہا لعل و گہر سے بھر کر خوب خو پذیرائی کی ہے۔

صنف غزل کیا ہے؟ اس سوال کا خوبصورت جواب نذیر صاحب نے دیا ہے۔ آپ نے صنفِ غزل کو اردو شاعری کی آبرو، شاخِ گل کی پوشاک، لب و عارض کی حکایت ،فکر و فلسفہ کی مظہر، آئینے کا سنگار، سنگ ریزوں کی پکار، دریا، آبشار، تخیل کی پیکر تراشی، احساسات کے اظہار کا موثر ذریعہ، خشک پتوں میں دبی آگ، برف میں دبے بارود کے استعارہ گردانا ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ اب تک غزل پر جتنی بھی رائے پیش کی گئی ہیں انہیں تلاش کر کے مرتب کیا جائے تو اچھی خاصی کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔

موصوف کی غزل گوئی پر نذیر صاحب نے محترم شاغل ادیب، ڈاکٹر محمد بشیر الدین اور سید ابوالخیر کشفی جیسی نابغۂ روزگار ہستیوں کی رائے اور ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کے اشعار بطور حوالہ پیش کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ روتا رہتا ہے دکھ میں غیروں کے ایسا ساگر کے پاس بھی دل ہے نہ صرف موصوف کی غزل بلکہ رباعی اور قطعات کا

بھی نذیر صاحب نے تجزیہ کیا ہے۔اس خوبصورت شعر

رنگت تو نرالی ہوتی ہے نیلا ہے کوئی پیلا ہے کوئی
ان رنگ برنگے پھولوں سے گلشن کی سجاوٹ ہوتی ہے

کے حوالے سے موصوف کی شاعری میں ہندوستان کو بھی تراشہ ہے۔ ہماری گنگا جمنی ہندوستانی تہذیب و ثقافت، کثرت میں وحدت، یگانگت جیسے اوصاف پر بڑا خوبصورت تبصرہ کیا ہے۔نذیر صاحب نے اسی باب میں یہ تلخ حقیقت بھی واضح کی ہے کہ چند شر پسند عناصر، ہندوستان کے دشمن کی طرح اس پر امن ملک جس کی فضائیں کبھی عطر اور عود کی خشبوؤں سے معطر ہوا کرتی تھیں آج نفرت کی آندھیوں اور بارود کی بو سے آلودہ کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔نذیر صاحب نے یہیں صوبوں اور سرحدوں کی سیاست پر بھی اپنے طنز کی کراری ضربیں لگائی ہیں۔

نذیر صاحب نے ڈاکٹر ودیا ساگر آنند صاحب کے فکر وفن پر نہ صرف اپنے وقیع، فصیح وبلیغ تبصرے وتجزیے تحریر کیے ہیں بلکہ (مناسب موقع ومحل پر) متعدد اہل نقد وبصیرت کے تاثرات اور گراں قدر آراء بھی پیش کی ہیں۔موصوف کے فکر وفن کو مزید واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اس کی ایک مثال بلیغ مضمون ''ڈاکٹر ودیا ساگر آنند خواتین اہلِ قلم کی نظر میں'' ہے۔اس مضمون میں نذیر صاحب نے مایہ ناز خواتین قلم کاروں کے زرّیں خیالات قلم بند کیے ہیں۔

تیسرے باب ''ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کے ممدوحین'' میں نذیر صاحب نے ڈاکٹر آنند اپنے والدین کے حضور، ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کا ایک تدوینی کارنامہ، ڈاکٹر ودیا ساگر آنند اور بہادر شاہ ظفر، ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کے منظوم نذرانے دربار ظفر میں، ڈاکٹر ودیا ساگر آنند اور اقبالؒ، ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کی جانب سے خراجِ عقیدت جیسے فصیح وبلیغ، بصیرت افروز مضامین تحریر کیے ہیں۔ بقول نذیر صاحب ڈاکٹر ودیا ساگر

آنند کے والد محترم جناب شیو دیال فرخ (مرحوم) اردو اور فارسی کے مدرس اور مشہور شاعر تھے۔ فنِ شاعری اور اردو محبت ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کو انھیں سے ورثے میں ملی ہے۔ ڈاکٹر آنند نے اپنے والدین کو جو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اس کے تناظر میں موصوف ایک معصوم بچہ نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر ودیا ساگر آنند صاحب کی مرتبہ ''جنگ آزادی کے اولین مجاہدین اور بہادر شاہ ظفر'' کا ذکر کرتے ہوئے نذیر صاحب نے اعتراف کیا ہے کہ شاعری کے علاوہ موصوف نے جن جن موضوعات کو اپنی سوچ وفکر کا محور بنایا ہے ان پر مفصل روشنی ڈالنا ایک مشکل ترین کام ہے۔

ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کی بہادر شاہ ظفر سے عقیدت اور ظفر کے باقیات کو دیارِ غیر سے لاکر خاک ہند کے سپرد کرنے کی قابلِ صد ستائش تحریک کی نذیر صاحب نے خوب پذیرائی کی ہے۔ آپ کی اس تحریک کو مہمیز کرنے کے لیے نذیر فتح پوری کا بے باک قلم یوں گویا ہوتا ہے۔ ''اس تحریک میں وہ لوگ شامل ہیں جو بھارت کی سرزمین سے ہزاروں میل دور اپنی روزی روٹی کی فراہمی کے لیے محنت و مشقت کر رہے ہیں۔ انہوں نے آزاد ہندوستان کی سنہری کرنوں کا لمس بہت ہی مختصر مدت کے لیے محسوس کیا ہے۔ برسوں سے یہ لوگ دیارِ غیر میں رہ رہے ہیں۔ اس کے باوجود یہ تارک وطن، غریب الدیار لوگ، اپنے وطن عزیز بھارت کے لیے کیسی کیسی مان اور شان بڑھانے والی باتیں نہ صرف سوچتے ہیں بلکہ اپنی تحریر و تحریک کے توسط سے، اپنے جذبات و خیالات، بیدار ذہنوں اور سیاسی بصیرت رکھنے والے لوگوں تک پہنچانے کا کام بھی کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ہم ہندوستان میں رہنے والوں کا کیا حال ہے؟ ہماری سوچ منفی ہو چکی ہے۔ ہندوستان کے ماتھے پر تلک لگانے کی بجائے ہم کلنک لگانے کا کام کرتے ہیں۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ ہم سارے ذہنی تحفظات اور مذہبی تعصبات بھلا کر

ودیا ساگر آنند کی تحریک میں شامل ہو جائیں۔ اس تحریک کو استحکام بخشیں۔ ارباب سیاست اور حاکمانِ وقت کے کانوں تک یہ بات پہنچائیں۔ اس طرح بہادر شاہ ظفر کو انصاف دلانے میں ہم اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔''

محترم نذیر فتح پوری صاحب نے ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کی ظفر نوازی پر بڑا ہی جامع تبصرہ کیا ہے۔ ہر زاویے سے موصوف کے اس منفرد وصف پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ جس میں مذکورہ بالا تحریک کے علاوہ بہادر شاہ ظفر کو ساگر آنند صاحب کے منظوم خراجِ تحسین کا ذکر بھی شامل ہے۔

ڈاکٹر ودیا ساگر آنند صاحب کے ''اقبالیات'' پر دیگر اہل بصیرت نے توجہ نہیں دی ہے مگر نذیر صاحب نے موصوف کی اقبالؒ پر کہی گئی منظومات کا بھی بڑی گہرائی اور گیرائی سے تجزیہ کیا ہے۔ نذیر صاحب نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ محترم ساحر شیوی صاحب نے ڈاکٹر آنند ساگر کو سب سے زیادہ منظوم خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ آپ نے ڈاکٹر آنند صاحب کی جانب سے محترم معین الدین شاہ صاحب کو دیے گئے خراجِ تحسین پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

چوتھے باب میں نذیر فتح پوری صاحب نے ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کے فکر وفن پر مرتب کردہ کتب پر تبصرہ کیا ہے۔ جن میں ''ڈاکٹر ودیا ساگر آنند، انسان، دوست، شاعر اور ادیب۔'' مؤلف ڈاکٹر یونس اگاسکر، ''محبتوں کا سفیر ودیا ساگر آنند'' مؤلف ڈاکٹر سیفی سرونجی اور ''ڈاکٹر ودیا ساگر آنند فن اور شخصیت'' مؤلف ڈاکٹر فراز حامدی شامل ہیں۔ اسی میں موصوف کے فکر وفن پر تحریر کیے گئے مقالات اور ان کے مصنفین کی فہرست بھی نذیر صاحب نے ترتیب دی ہے۔

پانچویں اور آخری باب میں ڈاکٹر ودیا ساگر آنند صاحب کی خوبصورت نثر کے چند نمونے پیش کیے گئے ہیں جن سے موصوف کا یہ وصف بھی نمایاں ہوتا ہے۔ ان میں

''راجہ رام موہن رائے''، ''مولانا ابوالکلام آزاد''، ''ونایک دامودر ساورکر'' اور ''ہندوستانی قومیت'' جیسے بصیرت افروز مضامین شامل ہیں۔ جو بہترین انشاء کے نمونے ہیں جنہیں پڑھ کر قاری محظوظ ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ محترم نذیر فتح پوری صاحب کے ادب شناس قلم نے اپنی نکتہ سنجیوں، تجزیوں، تحقیق، متعدد حوالوں اور خوش بیانیوں سے ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کا جو تخلیقی منظرنامہ تصنیف کیا ہے وہ مجمل و منفصل اور فصیح و بلیغ ہے جو ڈاکٹر ودیا ساگر آنند جیسے محبّ اردو، محبّ انسانیت اور محب وطن کو بہترین خراجِ تحسین ہے۔ نذیر صاحب نے اپنی تلاش و محنت اور نکتہ سنجی سے ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کے فکر و فن پر جو روشنی ڈالی ہے وہ اپنی افادیت، معیار کی بلندی و ندرت کے لحاظ سے قابلِ قدر بھی ہے اور قابلِ استفادہ بھی۔

آخر میں نذیر فتح پوری صاحب کا اجمالی تعارف درج ہے۔ نذیر صاحب نے اپنے شب و روز کی قیمتی ساعتیں اردو کے لیے وقف کر دی ہیں۔ آپ نے اپنے ادب شناس قلم سے مختلف موضوعات پر ۴۳ کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ہر محاذ پر اپنے فن کا لوہا منوایا ہے۔ آپ ناگفتہ بہ حالات میں بھی مشعلِ اردو بڑی جانفشانی سے اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے ہیں۔ اردو کے اس سپوت کو اپنی بے لوث ادبی خدمات، تحقیق و تنقید (بغیر کسی یونیورسٹی میں داخلہ لیے) اور گراں قدر کاوشوں کے بدلے Conspantinople Orthadox stitue U.S.A. نے اعزازی طور پر ڈاکٹریٹ کی اعلیٰ وارفع سند سے نوازا ہے۔۔ یہ آپ کی کامیابی کی معراج ہے اور بے لوث ادبی خدمات کی رسید بھی ہے۔ اس اعلیٰ وارفع اعزاز کے لیے میں تمام اہلِ اردو کی جانب سے ڈاکٹر نذیر فتح پوری صاحب کو تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ آپ کے بلند حوصلوں اور بے لوث اردو محبتوں کو سلام کرتا ہوں۔

****

جلیل الہ آبادی: شخصیت اور شاعری

ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی

جلیل الہ آبادی ۱۹۵۹ء میں بائیس سال کی عمر میں اپنے آبائی وطن موضوع سرائے داؤد، تحصیل پھولپور، ضلع الہ آبادی سے پونہ اور ۱۹۸۳ء میں اورنگ آباد منتقل ہوئے۔ بقول خود جلیل الہ آبادی کو کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا موقعہ حاصل نہیں ہوا۔ بے سروسامانی کی وجہ سے روایتی تعلیم بھی زیادہ حاصل نہیں کر سکے۔ لیکن ایالیان علم اور ارباب ذوق کی صحبت نے ذوق شعر پیدا کیا، جس کی مسلسل صیقل کاری ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ نوائے سروش نے فلک شعری پر تابانی پھیلانے کے لیے انھیں منتخب کرلیا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ پونہ جیسے عظیم شہر میں انھیں کا مجموعۂ کلام سب سے پہلے شائع ہوا۔ اس طرح انھیں پونہ کے صاحب دیوان شاعروں میں تقدم زمانی حاصل ہے۔ پھر تو ان کے کلام کے مجموعے متواتر شائع ہوتے رہے، یہاں تک کہ ان کی مجموعی تعداد بہ تفصیل ذیل پانچ تک پہنچ گئی۔

(۱) لہورنگ ۱۹۷۰ء مقام اشاعت ممبئی (۲) نئے زخم ۱۹۷۳ء مقام اشاعت ممبئی (۳) اڑان (۱۹۷۸ء۔ مقام اشاعت پونہ (۴) چوراہہ ۱۹۹۲ء۔ مقام اشاعت اورنگ آباد (۵) صدا بہ صحرا ۲۰۱۶ء۔ مقام اشاعت اورنگ آباد۔

زیر تبصرہ کتاب جناب جلیل الہ آبادی کے تذکرہ اور ان کی شاعری پر متعدد ممتاز قلمکاروں کے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں ایک توشیحی نظم کے علاوہ باب اول ''شخصیت'' میں مرتب کے تین مضامین ''گفت باہمی''، ''جلیل الہ آبادی۔ کچھ یادیں، کچھ باتیں'' اور ''جلیل الہ آبادی اور پونہ'' شامل ہیں۔ نذیر فتحپوری صاحب نے، کچھ

یادیں۔ کچھ باتیں'' کے تحت جلیل صاحب کی سادہ وصاف زندگی گزارنے کے علاوہ ان کی انتھک محنت کا خاکہ کھینچا ہے۔ اس باب میں قاضی ماشاق احمد کا ''اعتراف''، دلدار ہاشمی کی ''کچھ یادیں'' اور جمشید عالم فتحپوری کا ''فکروفن کا آئینہ'' کے علاوہ جلیل الہ آبادی کی ایک نظم شامل ہے جوانھوں نے اپنی اہلیہ کے انتقال پر کہی تھی۔ باب دوم میں بھی محمد خواجہ معین کا ایک مفصل مضمون بہ عنوان ''جلیل الہ آبادی۔ الہ آباد سے اورنگ آباد تک'' شخصیات ہی سے متعلق ہے۔

کتاب کا باب دوم جلیل الہ آبادی کی شاعری پر تیرہ مضامین کے علاوہ شاعر کی انیس غیر مطبوعہ غزلوں اور مرتب کی ایک نظم ''سوچیے'' پر مشتمل ہے۔ ان مضامین میں شاعر کے تمام ہی مجموعہ ہائے شعری پر ناقدین سخن کی مجمل یا مفصل مثبت رائیں ہیں۔ مشیر احمد کا تاثر یہ ہے کہ ''جلیل نے میدان شاعری میں غزل کو اپنایا ہے اور عمدہ مذاق پایا ہے۔ زبان صاف ستھری اور اکثر خیالات اور پیرایہ اظہار شگفتہ و دل پسند ہوتا ہے۔'' عالم فتحپوری جلیل کی شاعری کو زندگی کی ترجمانی قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر عصمت جاوید شیخ نے صنف غزل میں تغزل کی معنویت پر گفتگو کرتے ہوئے منتہائے تغزل تک پہنچنے میں جلیل صاحب کے عجز کا ذکر کیا ہے۔ اس کے باوجود وہ ان کے اشعار کی قدر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر

اب تک کی صدا سے نہیں آشنا جلیل
اپنی صدا کو ڈھونڈھ رہا ہوں صداؤں میں

ان کا کہنا ہے کہ جلیل الہ آبادی نے اپنی غزلوں میں انفرادیت پیدا کرنے کے لیے اپنے طور پر نئی زمینیں تلاشی اور تراشی ہیں جن میں کچھ سنگلاخ بھی ہیں۔ ان کے بہت سے اشعار میں ہندوستانی جمالیات کا سارا بانکپن سمٹ آیا ہے۔

خوابوں کی انجمن ہے ترا سانولا بدن

یا صبح کی کرن ہے ترا سانولا بدن

یہ جام یہ صراحی یہ نشہ یہ بانکپن

مہکا ہوا چمن ہے ترا سانولا بدن

''چوراہا'' پر تبصرہ کرتے ہوئے قاضی سلیم نے جلیل الہ آبادی کی ایک خصوصیت بتائی ہے جو تخصیص سے تعمیم کی طرف لے جاتی ہے جیسے :

شاید یہ کوئی اپنا مکافات عمل ہے

پیاسوں سے بہت دور برستی ہے گھٹا آج

قاضی صاحب جلیل کے پچیس سالہ شعری سفر کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ ''جلیل نے ان پچیس سالوں میں فنی ارتقاء کی کئی منزلیں سر کی ہیں۔ ان کی نظر میں زیادہ وسعت و گہرائی آئی ہے۔ زبان و بیان پر بھی پہلے سے زیادہ وہ قدرت حاصل ہوئی ہے۔ کلاسکی ترقی پسند اور جدید شاعری کے ورثے سے انھوں نے کسب فیض کیا ہے، اس لیے فیشن زدگی، بھیڑ چال کے وہ کبھی قائل نہیں رہے۔'' قاضی صاحب نے جلیل کے کلام کو حدیث دلبراں کے بجائے واردات ذات کا مظہر قرار دیا ہے۔ میر ہاشم کے بقول جلیل کی شاعری میں رشتوں کے ٹوٹنے، بکھرنے، مادیت پرستی، خود غرضی اور دوستوں کی بے وفائی کا ذکر اکثر آتا رہتا ہے۔

رفیق جعفر نے لکھا ہے کہ ''جلیل نے منفی رجحانات، تصوراتی جمالیات اور فیشن زدہ زبان و بیان اور نام نہاد جدیدیت کو نظر انداز کر کے اپنی روش کو برقرار رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام پر کسی استاد شاعر یا کسی، ہمعصر کی شاعری کی چھاپ نظر نہیں آتی۔ ان کی پسندیدہ کچھ بحریں ہیں جن میں وہ مشق سخن کرتے ہیں اور پتے کی بات کہہ جاتے ہیں۔'' انھوں نے جلیل کی قطعہ نگاری کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

جلیل الہ آبادی غزل کے شاعر ہیں۔ رفیق شاہین لکھتے ہیں ''جلیل الہ آبادی

نے (بھی) اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے غزل کا انتخاب کیا ہے اور نامساعد حالات کی یلغار سے نیم جاں اور بے سروسامان ہوتے ہوئے بھی اس نازنین، مہ جبین، شوخ والھڑ بت صد عشوہ طراز غزل کی مشاطگی اور گیسوآرائی سے کبھی غافل نہیں رہے۔'' مزید لکھتے ہیں ''ان کے یہاں نہ ژولیدگی ہے اور نہ پیچیدگی۔ ان کی شاعری ہر طرح کی تجریدیت، تکثیریت، ابہامیت، مہملیت، مجہولیت، انفعالیت، کثافت و دقاقت اور ثقالت سے پاک سیدھی سچی اور عام فہم شاعری ہے جو ترسیل و ابلاغ کی کسوٹی پر پوری اترتی ہے۔ یہ انداز اسلوب و نگارش ان کی شاعری کلاسیکیت اور روایت سے قریب تر معلوم ہوتی ہے۔''

پروفیسر عبدالوہاب نے جلیل الہ آبادی کی شاعری کو ایک منفرد آواز قرار دیا ہے جو صدا بصحرا نہیں ہے۔ ڈاکٹر لطیف سبحانی نے بھی جلیل الہ آبادی کی شاعری کو ''فکروفن کا سدابہار شجر'' قرار دیا ہے۔

شاہد پٹھان نے جلیل الہ آبادی کی غزل سرائی میں غالب کے غلبۂ ادب اور میر کی میری کو سراہا ہے ؎

وادیٔ فن میں عمر کٹی ہے بات جلیل مسلم ہے
میر کے جیسا درد میں ڈوبا شعر کہو گے کب بولو
فکر میر و غالب تک ہم کہاں پہنچ پائے
شاعری سمجھتے تھے قوت بیاں تک ہے

ڈاکٹر عصمت جاوید لکھتے ہیں کہ ''ان کی غزلوں کے اکثر اشعار اور بعض غزلوں سے مطلع سے مقطع تک گیت کی مٹھاس ملتی ہے۔ ان غزلوں میں ہندوی تہذیب کا رسیلا پن اور ہندوستانی زمین کا سوندھا پن ہے ؎

ہم جسے سمجھے ہوئے تھے من کا کھیل رفتہ رفتہ بن گیا جیون کا کھیل

گھر جلے اپنا بھری برسات میں
یہ بھی شاید ہے کوئی ساون کا کھیل

کب تلک دیکھا کروں میں درد سے
بجتی پائل میں ترے تن من کا کھیل

جلیل الہ آبادی کے مزید چند اشعار ؎

اسی باعث تو دنیا کی مصیبت کم نہیں ہوتی
یہ دنیا غم تو دیتی ہے شریک غم نہیں ہوتی

مجھے پاس بندگی تھا ترے آستاں کا ورنہ
کئی بار دیر و کعبہ مری رہ گذر میں آئے

کتنے عذاب کتنی بلاؤں میں قید ہیں
لگتا ہے جیسے اندھی گپھاؤں میں قید ہیں

جلیل کی غزلوں میں بھرپور تغزل ہے۔ فن اور فکر کا انوکھا بانکپن بھی ہے۔ ان میں تجدید فکر تو ہے لیکن جدیدیت نمایاں نہیں ہوتی۔ جلیل الہ آبادی شمال سے آئے اور جنوب میں چمکے۔ ع۔ غربت میں آ کے چمکا، گمنام تھا وطن میں

نذیر فتحپوری ساٹھ سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں شاعری کے علاوہ نثر میں انہوں نے مختلف شاعروں اور نقادوں کی حیات، شاعری اور کارناموں پر کئی کتابیں ترتیب دی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب نہ صرف ایک غریب الوطن بزرگ شاعر کو ان کا خراج عقیدت ہے بلکہ خود ان کی قبائے تقریر پر ایک تکمۂ زریں کا اضافہ ہے۔ دعا ہے کہ اللہ ان سے اسی طرح ادب کی خدمت کا کام لیتا رہے۔

کتاب کی پیشکش خوبصورت ہونے کے باوجود پروف کی بے شمار غلطیاں نگاہوں پر بار گزرتی ہیں۔

****

خواب بیتی (قسط نمبر ۲)

ڈاکٹر نذیر فتح پوری

خواب دورِ جدید کی پیداوار نہیں ہیں۔ بلکہ خوابوں کا سلسلہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا انسان۔ انسان جب سے پیدا ہوا ہے تب سے ہی خواب اس کے ذہن اور مزاج میں ہر زمانے اور ہر قوم میں خواب دلچسپی اور دلجوئی کا سبب بنے رہے۔ الگ الگ انداز سے الگ الگ معبروں نے خوابوں کی تعبیر بیان کرنے کی کوشش کی مگر ابھی تک پوری طرح خوابوں کی تعبیر کا مسئلہ حل نہیں ہوا۔

خواب کو نبوت کا چالیسواں حصہ بتایا گیا ہے۔ اسے ''پیام ربانی'' کہا گیا ہے۔ اسے ''عرفانِ روح'' اور ''نطق خداوندی'' بھی قرار دیا گیا۔ بعض خوابوں کے ذریعہ غیبی اشارے بھی سمجھائے گئے۔

میں نے مختلف اوقات میں مختلف قسم کے خواب دیکھے ہیں اور متعدد خوابوں کی تعبیر بھی سامنے آئی ہے۔ جن خوابوں کی مکمل مثبت تعبیر سامنے آئی ہے۔ اُن میں ایک خواب مندرجہ ذیل ہے۔

میرا پہلا ادبی خواب

میری پہلی غزل دہلی کے خاتونِ مشرق میں شائع ہوئی تھی۔ پہلی کہانی بھی خاتونِ مشرق ہی میں شائع ہوئی تھی۔ مولانا عبداللہ فاروقی اس رسالے کے مدیر تھے۔ دھیرے دھیرے میری نظمیں اور نثر خاتونِ مشرق کی وساطت سے قارئین تک پہنچنے لگی۔ اس زمانے میں میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ بہت ہی مختصر سا خواب، لیکن

ایک وسیع منظر لیے ہوئے۔ آج ۳۵ سال بعد بھی وہ خواب میری پلکوں پر چودھویں کے چاند کی طرح روشنی لٹا رہا ہے۔ اور میں اس روشنی میں آج بھی نہایا نہایا سا رہتا ہوں۔ خواب کچھ اس طرح تھا۔

''دہلی کے لال قلعہ کی دیوار کے سائے میں ایک بہت بڑا اسٹیج بندھا ہوا ہے۔ اسٹیج پر پیچھے کی طرف ایک بڑا سا پردہ لگا ہوا ہے۔ اس پردے پر بڑے بڑے حرفوں میں ''نذیر فتح پوری'' لکھا ہوا ہے۔ جس کا ہر حرف ستاروں سے جڑا ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے پردہ جھل مل جھل مل کرر ہا ہے۔ اسٹیج پر مولانا عبداللہ فاروقی تنہا کھڑے میرا انتظار کررہے ہیں۔ جب میں اسٹیج کے قریب آتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے اسٹیج کافی اونچا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اسٹیج پر چڑھنے کے لیے کہیں سیڑھی نہیں ہے۔ میں اسٹیج پر جانا چاہتا ہوں اور بیتابی سے ادھر اُدھر سیڑھیاں تلاش کرتا ہوں، مجھے پریشان دیکھ کر مولانا عبداللہ فاروقی اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہیں۔ میں اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیتا ہوں۔ اور وہ مجھے اسٹیج پر کھینچ لیتے ہیں۔ میں جھل مل جھل مل کرتے ہوئے اپنے نام کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہوں۔ اور پردے کے قریب جا کر اپنے نام کو مزید قریب سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے اسٹیج کے کپڑوں کا یا پردوں کا رنگ بھی وہی تھا جو لال قلعہ کی دیواروں کا تھا۔''

اس کے بعد اچانک میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ ان دنوں میں ٹین کی ایک چھوٹی سی کھولی میں مقیم تھا۔ گھر میں بجلی بھی نہیں تھی۔ ایک کونے میں لال ٹین جل رہی تھی۔ اس کی روشنی بہت مدھم تھی۔ اس وقت میری دو بیٹیاں زینت اور فضیلت عالم وجود میں

آ چکی تھیں۔ کھولی میں دو چار پائیاں تھیں۔ ایک پر میں تنہا، دوسری پر میری بیوی دونوں بیٹیوں کے ساتھ۔ ٹین کی کھولی میں سونے والا، مکتب تعلیم سے محروم۔ ۲۵۔۳۰ غزلوں اور دو چار کہانیوں کا ادبی سرمایہ جس کی جھولی میں ہو۔ وہ لال قلعہ کا خواب دیکھتا ہے۔ وہ بڑا سا اسٹیج دیکھتا ہے۔ اپنے نام کو ستاروں کی مانند جھلملاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ کیا بے پناہ خواب تھا۔ آج اس کی تعبیر سامنے ہے۔ اردو کی ٹوٹی پھوٹی خدمت کے عوض تقریباً اردو کی تمام بستیوں میں تھوڑا بہت جانا پہچانا سا لگنے لگا ہوں۔ اب تک ۵۲ کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ۳۲ سال سے ایک ادبی رسالہ اسباق مسلسل شائع کر رہا ہوں۔ اکثر مختلف اکادمیوں اور علمی، تعلیمی اور سماجی اداروں کی جانب سے پذیرائی بھی ہوتی رہتی ہے۔ انعامات و اعزازات کی ایک طویل فہرست ہے۔ میرے فکر و فن پر ایک صاحب ایم فل کے لیے مقالہ لکھ کر ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔ ایک صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے کام کر چکے ہیں۔ (مختلف خبارات و رسائل نے میرے فکر و فن پر اپنے خصوصی شمارے بھی شائع کیے ہیں۔ میری حیات اور ادبی خدمات کا احاطہ کرنے کے لیے کچھ احباب نے کتابیں بھی مرتب کی ہیں۔ یہی اس خواب کی تعبیر ہے۔)

قیافہ شناس کی باتیں

اسی خواب سے میل کھاتا ہوا قیافہ شناس کا یہ واقعہ بھی ملاحظہ فرمالیں۔

ایروڈا پونہ کی جس پترے کی کھولی میں ہم مقیم تھے۔ وہاں پڑوس میں ایک بار ایک قیافہ شناس کو دیکھا۔ جس کو آس پاس کی خواتین نے گھیر رکھا تھا۔ اتفاق سے میں دلدار ہاشمی کے ساتھ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ میری والدۂ محترمہ اور دیگر رشتہ دار خواتین بھی وہاں موجود اپنی اپنی قسمت کا حال معلوم کرنے کے لیے قطار میں لگی ہیں۔

جس کمرے میں یہ میلہ لگا تھا میں اور دلدار ہاشمی اس کی دہلیز پر رک گئے۔ قیافہ

شناس نے مجھے دیکھا تو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میرے انکار پر قیافہ شناس نے صرف میرا چہرہ یا پیشانی دیکھ کر مجھ سے کہا کہ ''آپ ودوان ہیں۔'' میں نے کہا ''میری تعلیم صرف درجہ پنجم تک ہوئی ہے۔'' اس نے کہا ''مجھے نہیں معلوم، میرا علم کہتا ہے کہ آپ ودوان (دانشور) ہیں۔'' دوسری بات اس نے یہ بھی کہی کہ ''آپ اپنے ماں باپ کی پہلی اولاد ہیں۔ اور یہ بھی کہا کہ ساری اولاد میں آپ کی ماتا جی کو آپ سے بہت پریم ہے۔ اور بتایا کہ آپ بھی اپنی ماتا جی کا بہت آدر اور سمان کرتے ہیں۔''

یہ اتفاق کی بات ہے کہ یہ ساری باتیں والدۂ محترمہ کی موجودگی میں ہو رہی ہیں۔ لیکن قیافہ شناس کو اس بات کا علم نہیں کہ میری والدہ محترمہ وہاں موجود ہیں۔ پھر اس نے ایک بات اور بتائی جو میرے اور خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ''اس نے کہا کہ اس وقت جو کاروبار تم کر رہے ہو وہ تمہیں پسند نہیں۔ تم ایک جگہ بیٹھ کر تجارت یا دوکان داری کرنا چاہتے ہو۔'' میں نے کہا یہ سچ ہے۔ میں رات دن یہی سوچتا ہوں کہ عمارت سازی کا جو کام میں کر رہا ہوں اسے خیر آباد کہہ کر کوئی تجارت کروں۔ یا کوئی ایسا کام جو مجھے خانہ بدوشی کی اذیت سے نجات دے دے۔ میں ایک کرسی اور ٹیبل پر بیٹھ کر کام کرنا چاہتا ہوں۔ اور پھر اس پیشہ ور قیافہ شناس نے آخری بات بتائی۔

''عنقریب کسی بڑے گھرانے میں تمہاری شادی ہونے والی ہے۔ تم ہر جمعرات کی شام مسجد میں چراغ جلایا کرو۔''

میں نے کہا ''میری شادی تو برسوں پہلے ہو چکی ہے۔'' قیافہ شناس میرے اس جواب پر خاموش ہو گیا اور اس کے بعد میں وہاں سے ہٹ گیا۔

خواب کی تعبیر اور قیافہ شناس کی باتوں کا آج کے تناظر میں جب میں جائزہ لیتا ہوں تو اس کی تعبیر میرے سامنے ہے۔ مکتبی تعلیم سے محرومی کے باوجود خدا نے علم و دانش کے دروازے مجھ پر وا کیے۔ عرفان و آگہی کا ذرہ برابر ہی سہی مجھے احساس دلایا

اور میرے علم اور میری بساط سے بڑھ کر تخلیقی صلاحیتوں سے مجھے مالا مال کیا۔ یہاں مجھے اپنے کچھ شعر یاد آرہے ہیں۔ جو زیر قلم مضمون کی حقیقت کو سمجھنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

سب کو حیرت ہے کہ اک امی لقب
لفظ و معنی کا پیمبر بن گیا
جس داستاں کے آخری حرفوں میں تھے کبھی
اس داستاں کا نقطۂ اول ہوئے ہیں ہم
کیا پھر سے سجائی ہے کوئی بزم زلیخا
کس واسطے یہ لوگ مجھے ڈھونڈ رہے ہیں
اے نذیر اک آئینہ تھا وہ بھی اندھا ہو گیا
شہر میں اب میرے جیسا ہو بہو کوئی نہیں

فلیٹ کی چابی

دس بائی دس کی ٹین کی کھولی میں رہ کر فلیٹ کا خواب دیکھنے کا شرف مجھے حاصل ہے۔ راکیل کی بدبو سے اور چمنی کے دھوئیں سے بھری ٹین کی اس کھولی میں میں نے جو اہم خواب دیکھے تھے ان میں سے ایک خواب مندرجہ ذیل بھی ہے۔

میں اپنی ٹین کی کھولی میں سویا ہوا ہوں۔ قریب ہی بچے بھی سوئے ہیں۔ اب چھ بیٹیاں اور دو بیٹے میری نسلی میراث کا حصہ بن چکے ہیں۔ گھر اتنا چھوٹا اور تنگ ہے کہ پیر رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔ ۱۵ رسال میں اتنا اضافہ ہوا کہ اب یہ کھولی بجلی سے محروم نہیں ہے ۔ دیوار میں ایک الماری کتابوں کے لیے بنا رکھی ہے۔ لکھنے پڑھنے کے لیے ایک معمولی ٹیبل موجود ہے۔ اسی ٹین کی کھولی سے اسباق کا اجراء ہوا ہے۔ ایک دیوار میں اسباق کے

مسودے رکھنے کے لیے ایک کھوکھا بنالیا ہے اس میں تین چار فائلیں موجود ہیں۔ ایک کونے میں بیوی نے کچن بنا رکھا ہے۔ برتن پر برتن رکھ کر بچوں کے سونے کے لیے جگہ بنائی گئی ہے۔ بیوی کی سلیقہ مندی نے اس ٹین کی کھولی کو بھی تاج محل بنا رکھا ہے۔ یہاں اس نے اپنے لیے ایک سلائی مشین بھی لگا رکھی ہے۔ تنگیِ داماں کی حکایت ہی نے تنگیِ مکان میں قید کر رکھا ہے۔ ورنہ آسمان کی سیر کرنے کا دل تو بہت چاہتا ہے۔

''یاد نہیں وہ کون سی برکتوں والی رات تھی۔ میں گہری نیند میں تھا کہ نورانی شعاعوں کے ساتھ ایک منظر نمودار ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ ایک باریش بزرگ میرے سامنے کھڑے ہیں۔ سفید کپڑوں میں۔ سر پر سفید عربی رومال باندھ رکھا ہے۔ میں نے جب غور سے دیکھا تو وہ نورانی چہرا حاجی سکندر خان علی خان چوہان کا تھا۔ جو میرے والد سے عمر میں چار چھ سال کم تھے۔ لیکن دور کے رشتے سے میرے بھانجے ہوتے تھے۔ احتراماً میں انہیں ''سکندر بھایا'' کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے۔ ''لے۔''

میں نے پوچھا ''کیا ہے؟''

''کہنے لگے فلیٹ کی چابی ہے۔'' میں نے دیکھا ان کے سیدھے ہاتھ میں ایک چابی جھول رہی تھی۔ میں نے اپنا سیدھا ہاتھ بڑھا کر یہ کہتے ہوئے چابی چھین ''لاؤ۔'' دوسرے ہی پل چابی میری مٹھی میں تھی۔ لیکن اتفاق کی بات ہے۔ یہ خواب ٹوٹا نہیں۔ اس لیے میری آنکھیں نہیں کھلیں۔ صبح جب نماز کے لیے اٹھا تو رات کا خواب ذہن میں ابھرنے لگا اور میں قسمت کے اس ''خوابی مذاق'' پر مسکرا دیا۔

جب کوئی اچھا خواب دیکھتا ہوں تو اپنی بیوی کو ضرور بتاتا ہوں۔ لیکن یہ خواب میں نے اسے نہیں بتایا چونکہ خود مجھے یہ ایک مذاق سے زیادہ نہیں لگا۔ اس لیے میں اس مذاق میں اپنی بیوی کو شامل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن، کبھی کبھی مذاق بھی حقیقت میں بدل جاتے ہیں۔ خواب کی مثبت تعبیر اگرچہ کم ہوتی ہے۔ لیکن ہوتی ضروری ہے۔ زندگی کی

تلخیوں کی قدرت کبھی کبھی شیریں احساسات سے بھر دیتی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ایئر پورٹ روڈ پر نیتا پارک جیسی خوبصورت سوسائٹی میں دو تین ماہ کے بعد میرا فلیٹ بک ہوگیا۔ ۵۰۰/اسکور فٹ کا۔ سمینٹ کانکریٹ سے بنی مضبوط عمارت کی تیسری منزل پر۔ ایک ہال، ایک بیڈ روم اور ایک کچن کے ساتھ ایک باہر نکلتی ہوئی بالکنی۔ فلیٹ کا نمبر بھی ایک تھا۔

خواب میں صرف چابی دیکھی تھی لیکن تعبیر فلیٹ کی صورت میں سامنے تھی۔

میں نے خوابوں کو موضوع بنا کر کتنے شعر کہے ہیں۔ اس کا اندازہ ابھی نہیں لگایا جا سکتا۔ کچھ شعر تو ضرور کہے ہوں گے۔ کیونکہ میں خوابوں کو عذاب نہیں سمجھتا۔ اسلام میں خواب کو نبوت کا چالیسواں حصہ بتایا گیا ہے۔ حضرت یوسفؑ کے جیسا خوابوں کی تعبیر بتانے والا مجھے کوئی نہیں ملا۔ ایک بار ایک عامل محبوب پاشا شاہ نوری سے ملاقات ہوئی تو میں نے اپنے کئی اہم خواب ان کو تفصیل سے بتائے۔ لیکن شاہ نوری صاحب نے کسی خواب کی تعبیر نہیں بتائی۔ صرف اتنا مشورہ دیا کہ اپنے پیر سے رجوع کریں۔

مفتی قطبِ عالم نقشبندی کشمیری سے میں بیعت ہوں۔ ان سے بھی کچھ خواب بیان کیے۔ انہوں نے چند ایک خوابوں کی تعبیر بتائی۔ جو پوری بھی ہوئی۔ لیکن سارا سب کچھ ہم کسی کو بتا بھی نہیں سکتے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ کوئی ہماری ساری باتوں کا جواب دے کر ہمیں پوری طرح مطمئن کر دے۔ اور پھر خوابوں کی حقیقت تو خدا ہی جانتا ہے۔ اس نے اپنے محبوب اور برگزیدہ بندوں کو خوابوں کے وسیلے سے بشارتیں دی ہیں۔

خواب بیتی (قسط نمبر ۳)

جادو، جادو، جادو

یہ خواب ان دنوں کا ہے جب میں پونے میں ایروڈا کی ٹین کی کھولی س نیتا پارک کے خوبصورت فلیٹ میں منتقل ہو چکا تھا۔ یہ فلیٹ دو تین سال تک ہی میرے لیے اور میری بیوی بچوں کے لیے راحت وسکون کا باعث بنا رہا اس کے بعد قسمت نے ایسا پلٹا کھایا کہ سارا سکون نیست و نابود ہو گیا۔ سب سے پہلے روزی کا سلسلہ منقطع ہوا۔ اس کے بعد میری صحت کو گہن لگ گیا۔ نوبت فاقوں تک آ گئی۔ ایک دن دوپہر کے بعد اچانک طبیعت بگڑ گئی۔ نیتا پارک کے سامنے ایک پرائیویٹ اسپتال تھا۔ میری بیوی مجھے وہاں لے گئی۔ ڈاکٹر نے ایک گھنٹے کی تفتیش کے بعد کہا کہ

''آپ ڈاکٹری کے حساب سے اتنے فٹ ہیں کہ فوج میں بھرتی ہو سکتے ہیں۔''

''میں نے کہا۔ مجھے یوں لگ رہا ہے کہ دس منٹ میں میرا دم نکل جائے گا۔''

ڈاکٹر نے اپنی فیس وصول کی اور دواؤں کا پرچہ لکھ کر بیوی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ تب تک سورج ڈوب چکا تھا۔

اُن دنوں عصر اور مغرب کے درمیان مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے کسی نے میرا دل مٹھی میں پکڑ رکھا ہے۔ اور اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔

ایک روز میں نے والدہ محترمہ کو بلایا۔ میری کیفیت دیکھ کر انہوں نے مشورہ دیا ممکن ہے کسی نے جادو ٹونا کروا دیا ہو۔ کسی عامل سے مل کر علاج کروالو۔ میں نے کہا، میرا دشمن کون ہو سکتا ہے، نہ میرے پاس دولت ہے نہ کوئی عہدہ ہے۔ نہ کسی سے میری

دشمنی ہے، پھر کون جادو کرتا ہے؟

اسی وقت مندرجہ ذیل مطلع ہوا تھا

تنکا تنکا ہے خدا کے ہاتھ میں   کچھ نہیں پاگل ہوا کے ہاتھ میں

لیکن اس پاگل ہوا نے میرے ساتھ ہی میرے گھر اور خاندان کے افراد کو پاگل بنا کر رکھ دیا۔ نیتا پارک کے اس فلیٹ میں ہم لوگوں نے ایسے بھیانک اور اذیت کوش دن گذارے کہ ان کی تفصیل قلم بند کرنے کے لیے کئی صفحات درکار ہیں۔ اس لیے میں یہاں صرف اپنے خوابوں کا ذکر ہی کر رہا ہوں۔

نیتا پارک کے فلیٹ میں میں نے اچھے کم اور برے خواب زیادہ دیکھے۔ اس دوران زندگی خوف کا ایک پھوڑا بن چکی تھی۔ ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا کہ جانے کب یہ پھوڑا پھوٹ جائے۔ اسی دوران دعائیں، آہ وزاریاں، صدقے، خیرات کا سلسلہ بھی جاری رہا اور ایک رات خدا نے رحم فرمایا۔ میں عشاء کی نماز کے بعد کھانے سے فارغ ہوگیا۔ سونے سے پہلے کمرے کی لائٹ بند کر چکا تھا۔ اندھیرے میں میں نے محسوس کیا جیسے میرے سرہانے ایک سایہ متحرک ہے۔ میں نے کروٹ بدل کر جب سایہ کی طرف دیکھا تو اندھیرے میں مجھے ایک بزرگ دکھائی دیے، سر پر سفید رومال، جسم پر ایسے کپڑے جو براق کی مانند چمک رہے تھے۔ ان کی پشت قبلے کی طرف تھی۔ وہیں کھڑے کھڑے اور مغرب کی سمت والی دیوار کی طرف بزرگ نے انگلی اٹھا کر تین بار فرمایا جادو، جادو، جادو...... اور اس کے بعد آگے بڑھے اور اس دیوار کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ دیوار کی بائیں جانب جو بالکنی تھی اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا جس کی وجہ سے باہر کی روشنی دیوار پر پھیلی ہوئی تھی۔ میں خواب ہی میں پلنگ سے اٹھ کر بزرگ کی پیٹھ کی طرف کھڑا ہوگیا۔ ان کے کندھوں پر سے جھانک کر دیکھنے لگا۔ اسی دوران بزرگ کے ہاتھوں میں ایک بڑا سا لیموں دکھائی دیا۔ جسے انہوں نے دیوار پر لگی فرشی کی اوپر کی

دھار سے کاٹنا شروع کیا۔ چند ساعت میں لیموں درمیان سے کٹ گیا اور اس کا نصف حصہ فرش پر گر گیا۔ جو نصف حصہ بزرگ کے ہاتھ میں رہ گیا تھا۔ اس میں سے کالے رنگ کا ایک چھوٹا سا بھونرا زندہ برآمد ہوا۔ جیسے ہی وہ بھونرا لیموں سے نکل کر چلنے کی کوشش کرنے لگا۔ گھبرا کر میری آنکھیں کھل گئیں۔ اور پھر فجر کی اذان تک میں بے تاب رہا۔ آنکھوں میں نیند کے آثار دور دور تک نہیں تھے۔ ایک اضطرابی کیفیت کے ساتھ ہلکا سا خوف کا ہیولیٰ میری روح کے ارد گرد بگولے کی مانند سرگرداں محسوس ہوا۔ صبح اٹھنے کے بعد میں نے اپنے دو تین بھائیوں کو بلا کر تمام کیفیت بیان کی۔ اور ان سے کہا کہ کسی بھی جان کار عامل سے مل کر اس سلسلے میں علاج کرانے کی کوشش کریں۔

اس سلسلے میں چند ایک حضرات سے ملاقات ہوئی، سارا ماجرا بیان کیا۔ لیکن کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ مشتاق مدنی کھڑکی میں ایک صاحب کے پاس لے گئے۔ انہوں نے اپنے طور پر سارا معاملہ جان کر کے بتایا کہ آپ پر جو سحر (جادو) کیا گیا ہے اس کے حساب سے تو اب تک آپ کو زندہ ہی نہیں رہنا چاہیے تھا۔ لیکن کسی کی دعا ہے جس نے آپ کو بچا لیا، انہوں نے پانی پڑھ کر دیا اور کچھ عمل بھی بتایا لیکن اطمینان نہیں ہوا۔ پھر ایک قاری صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بھی یہی فرمایا کہ آپ پر جادو کیا گیا ہے۔ میں آپ کا علاج کروں گا اور آپ سے کوئی معاوضہ بھی نہیں لوں گا۔

موصوف نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اس دن کے بعد ذاتی طور پر مجھے راحت ملی۔ صحت بھی سنبھل گئی اور تھوڑی بہت روزی کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ لیکن فلیٹ میرے قبضے سے نکل گیا اور مجھے ہر حال میں اسے فروخت کرنا پڑا۔ اکثر عالموں نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ "یہ فلیٹ آپ چھوڑ دیں۔" ایک صاحب نے تو وثوق کے ساتھ کہہ دیا تھا کہ "یہ فلیٹ آپ کو چھوڑنا ہی پڑے گا۔"

ریچھ کی مشابہت والی گڑیا

میں نے خواب میں کبھی ریچھ نہیں دیکھا۔ البتہ ایک گڑیا دیکھی تھی جو مجھے ریچھ کے بچے جیسی نظر آئی تھی۔ ''خواب و تعبیر'' میں لکھا ہے کہ ......

''ریچھ پر سواری کرنے والے کو نقصان پہنچے گا اور اگر دیکھے کہ ریچھ کو نچاتا ہے تو کوئی احمق یا نادان دوست صاحب خواب کو اپنے قبضے میں کرے گا۔ اور اگر دیکھے کہ ریچھ کو پیٹتا ہے تو دشمن پر غلبہ حاصل کرے گا اور اپنی مراد کو پہنچے گا۔'' صفحہ نمبر ۱۲۸

ریچھ کے تعلق سے یہ مختلف ماہرین کی رائے ہے۔ ریچھ ہر حال میں سانپ کی طرح مکمل دشمنی کی علامت ہے۔ ریچھ کا چہرہ دیکھیے۔ اس کا سیاہ جسم اور جسم پر اُگے بال دیکھیے۔ اس کے دانت دیکھیے۔ ناخن دیکھیے۔ بچے تو بچے ریچھ کو دیکھ کر بڑے بھی اندر سے کہیں سہم جاتے ہیں۔ یہ ساری نشانیاں اس بات کی شاہد ہیں کہ ریچھ کبھی کسی کا دوست ہو ہی نہیں سکتا۔ اب ملاحظہ کریں۔ ریچھ سے مشابہت رکھنے والی اس گڑیا کی قلابازیاں۔ یہ گڑیا کسی شاطر دشمن کی طرح کیسے کیسے روپ بدل کر میرے سامنے آتی ہے، اور مجھے خوف وہراس میں مبتلا کرتی ہے، نیتا پارک کے فلیٹ میں قیامت کے دوران ہی یہ خواب دیکھا تھا۔

ایک رات ایک کالی گڑیا اچانک دکھائی دیتی ہے، اس کی شکل ریچھ کی صورت سے ملتی جلتی ہے ریچھ کی مانند پیچھے کے دو پیروں پر بیٹھنے والی اس گڑیا کو دیکھتے ہی میں ڈر جاتا ہوں۔ گڑیا ایک دم میرے سامنے بیٹھی ہے، اس کی آنکھوں اور چہرے کی حرکات سے یوں لگتا ہے جیسے وہ گڑیا نہیں بلکہ ریچھ کا نومولود بچہ ہو اچانک میں اسے اٹھا کر دور پھینک دیتا ہوں۔ وہ اسپرنگ لگے کھلونے کی طرح ایک ٹپا کھا کر پھر میرے روبرو آ کر مجھے ڈرانے لگتی ہے۔ میں وہاں سے ہٹ جاتا ہوں اور دوسری طرف جا کر بیٹھ جاتا ہوں دوسرے ہی پل وہ کالی گڑیا پھر میرے سامنے آ کر بیٹھ جاتی ہے اور مجھے

چھیڑنے کے لیے عجیب وغریب حرکتیں کرتی ہے، خوف اور غصے کے ملے جلے اثرات سے مغلوب ہو کر میں اس گڑیا کو دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑ کر ایک طرف دوڑنے لگتا ہوں، دوڑتے دوڑتے ایک کنویں پر میری نگاہ پڑتی ہے۔ میں فوراً کنویں کی منڈیر پر چڑھ جاتا ہوں اور پوری طاقت کے ساتھ اس گڑیا کو کنویں میں پھینک دیتا ہوں۔ اسے کنویں میں پھینک کر فوری طور پر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک بڑی بلا کو میں نے غرق آب کر دیا۔ اب میری ساری مصیبتیں دور ہو جائیں گی، غم و آلام کے جو بادل میری زندگی پر ایک مدت سے چھائے ہوئے ہیں وہ سارے کے سارے چھٹ جائیں گے۔ میری زندگی میں جو اندھیرا چھایا ہوا ہے وہ اسی کالی گڑیا کے پرتو کا اثر تھا اب یہ اندھیرا اجالے میں بدل جائے گا۔ ان باتوں کو محسوس کرنے کے بعد مجھے چین کا سانس نصیب ہوتا ہے۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ اپنی پوری شدت پرواز کے ساتھ وہ کالی گڑیا کِھل کِھل کرتے ہوئے کنویں سے باہر آجاتی ہے۔ اسے دیکھتے ہی میں پھر ایک انجانے خوف میں مبتلا ہو جاتا ہوں اور چکرا کر گر جاتا ہوں۔ اسی لمحے میری آنکھیں کھل جاتی ہیں...... اور خواب ٹوٹ جاتا ہے۔ نہ وہاں کنواں ہے نہ وہ کالی ریچھ والی گڑیا ہے۔ صرف چاروں طرف ایک جان لیوا سناٹا ہے۔ رات کی سسکیاں محسوس کر کے مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے یہ میری حالت پر رو رہی ہے۔

مجھے کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے وہ کالی باہولی (گڑیا) آج بھی میرا پیچھا کر رہی ہے......

پہاڑ کا ٹوٹنا اور پتھروں کی بارش

دن اور تاریخ تو یاد نہیں، سال ۲۰۰۴ء کی بات ہے ایک خواب ایسا بھی دیکھا تھا۔ جیسے ایک پہاڑ ہے۔ میں اس پہاڑ کے نیچے کھڑا ہوں۔ اچانک ایک شور بلند ہوتا ہے۔ زمین میں جیسے زلزلہ سا آجاتا ہے۔ اور اس کے بعد پہاڑ ٹوٹنے اور بکھرنے لگتا

ہے۔ پھر ٹوٹ ٹوٹ کر میری جانب لڑھکنے لگتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں جس طرف جاتا ہوں پتھر لڑھک کر اسی جانب حملہ آور ہوتے ہیں۔ میرے علاوہ وہاں کوئی دوسرا نہیں ہے۔ میں گھبرایا ہوا ضرور ہوں لیکن ہمت نہیں ہار رہا ہوں۔ اپنے بچاؤ کے لیے پوری کوشش کر رہا ہوں، لیکن پہاڑ بہت دور میں پھیلا ہوا ہے۔ مجھے وہاں سے نکلنے کے لیے کوئی راستہ نہیں ملتا۔ جس طرف بھاگتا ہوں۔ اسی طرف سے پہاڑ ٹوٹنے لگ جاتا ہے اور پتھر میری جانب لڑھکنے لگتے ہیں۔ پہاڑ سے میری یہ مقابلہ آرائی دیکھنے کے لیے وہاں کوئی موجود نہیں۔ میں اپنے آپ کو چاروں طرف سے پہاڑوں میں گھرا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ لیکن پتھروں کی اس یلغار کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کسی پتھر سے معمولی خراش بھی مجھے نہیں آتی۔ پہاڑ ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔ اور میری آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ پہاڑ کی طرح خواب بھی ٹوٹ جاتا ہے۔

تنکے کا سہارا

برسوں پہلے ایک خواب دیکھا تھا۔

فتح پور میں میرے ننھیال کے سامنے جو کنواں ہے۔ اس کی ''سارنڈ'' میں پانی بھرا ہوا ہے۔ میں اس پانی میں ڈوب رہا ہوں۔ میں مدد کے لیے آواز لگاتا ہوں۔ میری آواز سن کر اوپر سے ایک ہاتھ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے پانی سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ خواب میں صرف ہاتھ دکھائی دیتا ہے۔ کسی کا وجود دکھائی نہیں دیتا۔ وہ ہاتھ مجھے بچانے کی بہت کوشش کرتا ہے۔ لیکن پانی نے میرے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ میں گلے تک پانی میں ڈوبا ہوا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ چہرا اور سرا بھی تک پانی سے محفوظ ہیں۔ وہ ہاتھ اپنی پوری طاقت لگا کر مجھے پانی سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ بار بار مجھے اوپر کھینچنے کے لیے پوری طاقت کا استعمال کرتا ہے۔ لیکن کامیاب نہیں ہو پاتا۔ اچانک

مجھے درودِ پاک کے ورد کا احساس ہوتا ہے۔ یا کوئی اشارہ کرتا ہے اور میں جیسے ہی درود شریف پڑھنے لگتا ہوں۔ پانی میرے پاؤں فوراً چھوڑ دیتا ہے اور میں پھول کی طرح اپنے پورے وجود کے ساتھ اوپر آجاتا ہوں۔ وہ ہاتھ مجھے کنارے تک پہنچا کے غائب ہوجاتا ہے اور آنکھ کھل جاتی ہے۔ دل بری طرح دھڑک رہا ہے۔

دراصل مجھے تیرنا نہیں آتا۔ پانی سے مجھے ہمیشہ ڈر لگتا ہے۔ میں کشتی میں بیٹھ کر سیر کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ خواب میں مجھے جب بھی پانی دکھایا گیا اس پانی نے کبھی مجھے نقصان نہیں پہنچایا۔ میں ہمیشہ محفوظ رہا۔ لیکن آنکھیں کھلنے کے بعد دیر تک دل کی دھڑکنوں میں انتشار رہا۔

....

پُرانے زمانے کی دادی اور نانی قسم کی عورتوں کا کہنا تھا کہ سوتے وقت کسی کو پیاس محسوس ہو اور وہ پانی پیے بنا ہی سو جائے تو اسے نیند میں پانی دکھائی دیتا ہے۔ لیکن میرے اپنے تجربے کے مطابق یہ درست نہیں ہے۔

خوابوں کی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے بعض نے لکھا ہے کہ ہماری اپنی ہی دبی ہوئی یا ادھوری خواہشات خوابوں کے دریچوں سے جھانک کر اپنی تکمیلیت کا احساس دلاتی ہیں۔ بعض نے اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ من و عن درست نہیں ہے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں ''جو بھی خواب دیکھا جائے وہ محض خیالی یا بے مطلب نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے اندر کوئی نہ کوئی حقیقت ضرور ہوتی ہے۔''

میں نے ابتداء میں اپنے دو خواب بیان کیے۔ وہ دونوں خواب میرے لیے نقصان کا سبب بنے۔ بعد کے دو خواب پہاڑوں کا ٹوٹ کر مجھ پر حملہ آور ہونا اور پانی میں میرا ڈوبنا۔ بظاہر میرے لیے نقصان دہ ضرور تھے۔ میرے دشمنوں نے مجھ پر شدید حملہ کیا تھا۔ لیکن خدا کے کرم سے نہ پتھر مجھے زخم پہنچا سکے اور نہ پانی مجھے ڈبا سکا۔

افسانہ

ایک خط کے جواب میں

نذیر فتح پوری

تمہارا خط ملا تم اتنی اچھی اردو لکھنے لگے ہو، مجھے اندازہ نہیں تھا، زبان بھی تم نے بڑی صاف ستھری لکھی ہے۔ تمہارے انداز مخاطب کا بھی کوئی جواب نہیں، دادی ماں نے تمہارا خط سن کر تمہیں بہت سی دعائیں دیں، یار تم قسمت والے ہو، بیس سال کے بعد تم نے ایک خط لکھا اور سب گھر والوں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ قلم سے دلوں کو جیتنا کوئی تم سے سیکھے، تمہارے انداز تحریر میں بلا کی مقناطیسیت ہے، ہر لفظ دامن دل کو کھینچتا ہے۔ میں تم سے حسد کرنے لگا ہوں یار! لیکن میری والدہ یعنی تمہاری بڑی امی، وہ تمہیں بہت چاہنے لگی ہے۔ جب سے تمہارا خط ملا ہے تب سے وہ تمہاری راہ دیکھ رہی ہے۔ میں نے لاکھ سمجھایا کہ جاوید کا انڈیا آنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ ویزے کا مسئلہ ہے سرحدی تنازعوں نے دونوں طرف بارود بچھا رکھی ہے اور ہاں یار جاوید! رانی تمہیں سلام کہتی ہے۔ تمہیں گھر میں سب سے زیادہ رانی ہی یاد کر رہی ہے۔ رانی تمہیں یاد ہے نا! میری چھوٹی بہن، تم بچپن میں اسے بہت ستایا کرتے تھے، کبھی نکٹی اور کبھی کنکٹی کہہ کر چھیڑا کرتے تھے، حالانکہ خاندان کے تمام بچوں میں رانی کی ناک سب سے نکلی ہوئی تھی کان بھی چھوٹے نہیں تھے۔ لیکن تم رانی سے محبت بھی سب سے زیادہ ہی کرتے تھے، تمہیں یاد ہے۔ جب اسکول میں ایک لڑکی نے رانی کو سیڑھیوں سے دھکیل دیا تھا تو اس کے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ تم اس حادثے پر کتنا دکھی ہوئے تھے۔ رانی جتنے دنوں اسپتال میں رہی تم ہی اس کے لیے دونوں

وقت کا ٹفن لے جایا کرتے تھے۔ رانی مجھ سے زیادہ تمہیں اپنا بھائی مانتی تھی، جانتے ہو جاوید! رانی کا کیا ہوا؟ لیکن رہنے دو یار! تم رانی کی درد سے لبالب داستان سن کر بلک اٹھو گے' آ کر خود ہی دیکھ لینا' جب سے تمہارا خط آیا ہے رانی نے اپنی آنکھوں کو راستے کی کہکشاں بنا دیا ہے۔ ہر آہٹ پر پوچھتی ہے کیا جاوید بھائی آ گئے؟ کب آئیں گے جاوید بھائی! ہاں یار! کب آؤ گے تم؟ ابا جی بھی پوچھ رہے تھے۔ اب بہت کمزور ہو گئے ہیں، ٹی۔ بی کی بیماری کے دوران کافی خون تھوکا ہے انہوں نے، لیکن ایک بات اچھی ہوئی، بیمار ہونے سے ان کے نشے کی عادت چھوٹ گئی، مسجد کا رخ تو انہوں نے اب بھی نہیں کیا لیکن میخانے کا رستہ چھوڑ دیا ہے۔ تم نہیں جانتے جاوید! ابو نے امی کو کتنی اذیت پہنچائی ہے۔ شراب کے نشے میں امی کے ساتھ وہ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کرتے تھے۔ وہ تو ایک دن ہمت کر کے میں نے بغاوت کر دی، ایک بار جب وہ امی کو مارنے کے لیے ہاتھ اٹھا رہے تھے تب میں نے پوری طاقت سے ابو کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اس دن کے بعد ابو نے امی پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا۔ لیکن مجھے اپنی محبتوں سے محروم کر دیا۔ بلکہ مجھے گھر میں وہ اپنا سب سے بڑا حریف سمجھنے لگے ہیں۔ تم بتاؤ یار! کیا ایسا کر کے میں نے کوئی غلطی کی ہے۔ میں اپنی ماں پر ظلم ہوتے ہوئے کب تک دیکھتا رہتا، چاہے ظلم کرنے والا اس کا شوہر ہی کیوں نہ ہو۔ تم کو شاید معلوم نہیں کہ اسی وجہ سے ابو نے مجھے جائیداد سے محروم کر دیا ہے کھیت کی زمین، حویلی اور دکانیں، سب کچھ میرے دونوں چھوٹے بھائیوں کے نام کر دیا ہے۔ میرے بھائی بھی اتنے خود غرض ہوئے کہ خوشی خوشی سب کچھ قبول کر لیا۔ کسی نے بھی میرے حصے کا خیال نہیں کیا۔ وصیت نامے کی ایک نقل دونوں بھائیوں نے اپنے اپنے قبضے میں کر لی، ماں سے محبت کی مجھے اتنی بڑی سزا ملی

، مجھے اپنا موروثی گھر بھی چھوڑنا پڑا، لیکن مجھے کوئی ملال نہیں، میرا ضمیر صاف ہے، خدا پر میرا بھروسہ ہے۔ اس لیے مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔ تم آؤ گے تو ساری باتیں تفصیل سے بتاؤں گا۔ لیکن تم کب آؤ گے، نہ آؤ تو بہتر ہے جاوید! تم پاکستانی ہو، حالانکہ تمہاری پیدائش ہندوستان میں ہوئی۔ تمہارے باپ دادا بھی ہندوستان میں ہی پیدا ہوئے۔ ہندوستان ہی میں ان کی قبریں بنیں، لیکن اس وقت پاکستان کہاں تھا، زمین کی حدیں کہاں قائم ہوئی تھیں، ب کچھ ایک ہی تھا۔ انگریز قابض تھا ہماری تقدیروں پر، وہ گیا تو دیوار کھڑی کر گیا، نفرت کے بیج بو گیا۔ بٹوارے سے پہلے جب تم آٹھ برس کے تھے۔ چچا جان کا انتقال ہو گیا تھا۔ چچی یعنی تمہاری والدہ بھی جوانی میں بیوہ ہو گئیں۔ انہوں نے ایک لاہوری سے نکاح کر لیا تھا۔ ماں کے ساتھ تم بھی لاہور چلے گئے۔ میری عمر تم سے ایک برس ہی تو کم تھی۔ رانی ہم دونوں سے چھوٹی تھی۔ پاکستان بن گیا تو تم وہیں رہ گئے۔ لیکن یار! تم مہاجر کیسے ہو گئے جیسا کہ تم نے اپنے خط میں ذکر کیا ہے۔ جب پاکستان وجود میں آیا تب تو تم لاہور ہی میں تھے، تمہارے سوتیلے والد لاہوری تھے۔ تم نے لکھا کہ تمہارا گھر جلا دیا گیا، تمہاری والدہ کو جلا کر مار ڈالا گیا، تمہاری بہن کو اٹھا کر لے گئے اور تمہیں جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ کیسا کیسا ظلم ہوا تمہارے خاندان کے ساتھ، لیکن بھائی! تم یہاں آؤ گے تو پاکستانی ہی کہلاؤ گے، یہاں کوئی تمہیں مہاجر نہیں کہے گا۔ کوئی یہ نہیں دیکھے گا کہ تم ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے، یہاں اسکول میں آج بھی تمہارا نام کسی رجسٹر میں درج ہو گا۔ تم یہاں ایک ہندی اسکول میں پڑھا کرتے تھے۔ تمہاری کلاس میں تمہارا ہندی خط سب سے اچھا تھا جس کے تمہیں الگ سے نمبر ملتے تھے، ہندی میں تمہاری فطری صلاحیت دیکھ کر اسکول کے ہیڈ ماسٹر جی نے تمہیں ہندی کا پنڈت

بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ تمہیں یاد ہے رام پرساد سکسینہ، کیسے نیک دل انسان تھے، اقبال کے ترانے سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' پر دل و جان سے عاشق تھے، تمہیں یاد ہوگا، بچپن میں تم یہ ترانہ بہت اچھا گاتے تھے، ہیڈ ماسٹر سکسینہ جی اکثر تم سے یہ ترانہ سنا کرتے تھے۔ لیکن اب تو تم پاکستانی ہو۔ میرا خیال ہے اقبال کا ترانہ آج بھی تمہیں یاد ہوگا لیکن اب یہ تمہارے کام نہیں آسکتا، جب پاکستان ہی تمہارے کسی کام نہیں آیا تو باقی کون تمہارے کام آسکتا ہے۔ اسی لیے جاوید ! میں ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں کہ تم انڈیا مت آنا، سچ، تو یہ ہے کہ کسی کو یہاں تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ جانتے ہو، کل جب میں امی جی سے ملنے گھر گیا تو ابو جی نے برسوں بعد مجھ سے بات کی، مگر اتنا ہی کہا کہ ''جاوید کو لکھ دو کہ وہ انڈیا نہ آئے، اب اس کا یہاں کوئی نہیں ہے۔'' میرے دل پر تو جیسے بجلی گر پڑی۔ ابو کی سخت کلامی تو پہلے ہی سے مشہور ہے۔ لیکن تمہارے بارے میں وہ اتنی جلدی اور ایسے سفاک لہجے میں فیصلہ سنا دیں گے، مجھے یقین ہی نہیں آیا۔ جب دادی اماں نے مداخلت کرنے کی کوشش کی تو ابو نے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔ ''ہم جاوید کو یہاں بلا کر اپنی خوش حال زندگی میں کانٹے نہیں بونا چاہتے، تم بھول جاؤ کہ جاوید تمہارا پوتا ہے۔''

دادی بیچاری دل مسوس کر رہ گئیں ایک اسی برس کی بوڑھی بے بس ہندوستانی عورت اور کر بھی کیا سکتی ہے۔ مجھے تو رانی کی فکر ہے۔ یہ خبر سن کر وہ رات بھر روتی رہی اپنی بجھی آنکھوں سے اس نے اتنے آنسو بہائے کہ اس کا دامن آنسوؤں سے تر ہوگیا، ہاں جاوید! تیری گڑیا جیسی بہن رانی اندھی ہو چکی ہے۔ جہیز کے لالچی ساس سسر نے اسے زہر دے کر مارنا چاہا تھا، ڈاکٹروں نے رانی کو تو بچا لیا لیکن وہ آنکھوں سے محروم ہوگئی۔ دادی، اماں جی اور رانی کو تو بچا لیا لیکن وہ آنکھوں سے محروم ہوگئی۔

دادی، اماں جی اور رانی، ابو کے گھر میں تین مظلوم عورتیں ایک ساتھ جینے پر مجبور ہیں۔ چلو اچھا ہوا تم نہیں آ رہے ہو۔ ورنہ تم اس گھر کی تباہی کا منظر دیکھ کر خوش نہیں ہوتے، میں ان دنوں تمہاری بھابی کے گھر یعنی اپنی سسرال میں رہ رہا ہوں۔نہیں بھائی! گھر داماد نہیں ہوں۔اب میرا بنگلہ بن گیا ہے۔ میں نے ایک قیمتی گاڑی بھی بک کر لی ہے۔ جب میں اپنے نئے گھر میں شفٹ ہو جاؤں گا تو تمہیں ضرور بلاؤں گا۔ میں ان تین مظلوم عورتوں کو بھی اپنے پاس لے آؤں گا۔ دو سال بعد مجھے ساجدہ کی شادی کرنی ہے۔لڑکا بھی دیکھ لیا ہے۔رانی کے لیے ابو کے پاس جہیز نہیں تھا۔لیکن ساجدہ کے ہونے والے شوہر کو میں سونے کی زنجیر سے باندھ کر اپنے خوبصورت بنگلے کا دربان بنادوں گا۔تم یار! ساجدہ کی شادی میں ضرور آنا، کیوں کہ میں اپنے دونوں بھائیوں کو شادی میں نہیں بلاؤں گا۔ابو کو شادی کا رقعہ بھیجوں گا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ شادی میں ہرگز نہیں آئیں گے میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ابو شادی میں نہ آئیں۔تم آجانا یار! تمہارے آنے سے میں سمجھوں گا جیسے پورا خاندان ساجدہ کو مبارکباد دینے کے لیے آگیا ہے۔تم آؤ گے نا یار! پچیرے ہوئے تو کیا ہوا۔آخر تم میرے بھائی ہو۔ابو کے سلوک کی سزا مجھے مت دینا جاوید! تم ساجدہ کی شادی میں ضرور آنا۔لیکن یار! یہ سرحد سے کیسی بو آ رہی ہے؟

☆☆☆☆

ڈاکٹر نذیرؔ فتح پوری۔اجمالی تعارف

نام : نذیرؔ احمد خان جوڑ

والدین : حاجی ابراہیم خان جوڑ۔حجن سائرہ بی مرحومہ

وطن : فتح پور شیخاوائی ضلع سیکر راجستھان

سن پیدائش : یکم دسمبر 1946ء بمقام محلہ زمینداروان، خانجی کی حویلی، فتح پور شیخاوائی، راجستھان

تعلیم : درجۂ پنجم۔اسلامیہ اسکول عیدگاہ فتح پور شیخاوائی

تلمذ : عتیق احمد عتیقؔ، کالی داس گپتا رضاؔ۔

انعامات واعزازات:..........

☆ 1992ء میں راجستھان اردو اکیڈمی کا ایوارڈ۔

☆ 1993ء میں آل انڈیا میر اکیڈمی یو پی کی جانب سے شعری مجموعہ 'تیسرا سفر' پر میر تقی میر ایوارڈ۔

☆ 1994ء پونہ سے ''چراغ غزل'' ایوارڈ۔

☆ 1995ء میں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی کی جانب سے 'لفظوں کے سائے تلے' پر انعام۔

☆ 1999ء میں پونے میونسپل کارپوریشن کی جانب سے پونے کے میئر کے ہاتھوں اعزاز اور ممنتو۔

☆ 2000ء میں راجستھان اردو اکیڈمی کی جانب سے 'جگن ناتھ آزاد، ایک مستقل اردو' پر انعام۔

☆ 2000ء میں بہار ساہتیہ سنسد سمستی پور کی جانب سے 'جگن ناتھ آزاد۔ایک مستقل ادارہ' پر خواجہ احمد عباس ایوارڈ۔

☆ 2001ء میں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی کی جانب سے 'نیا دن چھوٹ کر نکلا' پر انعام۔

☆ آل انڈیا قومی یکجہتی کمیٹی فرید آباد کی جانب سے ایک نظم پر آل انڈیا قومی یکجہتی انعام۔

☆ دہلی سے استاد رشید رامپوری ایوارڈ۔

☆ بنگلور سے 'غالب' ایوارڈ۔

☆ نکڑ اردو ڈرامہ 'گرو' پر آل مہاراشٹر انعامی مقابلے میں اول انعام تفویض۔

☆ تنظیم جماعت المسلمین فتح پور کی جانب سے اعزاز۔

☆ انڈین کمپیوٹر ایجوکیشن فتح پور کی جانب سے اعزاز۔

☆ یکم جون 2000ء کو اسلامیہ اسکول عید گاہ فتح پور کی جانب سے عوامی جلسے میں ایس ڈی ایم جناب اے ڈی۔ مہرڈا کے ہاتھوں سپاس نامہ اور شال دے کر اعزاز کیا گیا۔

☆ 2003ء میں تعمیر سوسائٹی ادے پور راجستھان کی جانب سے 'غالب' ایوارڈ۔

☆ 2003ء میں 'جشن امین حزیں' کمیٹی پونہ کی جانب سے 'امین ادب' ایوارڈ۔

☆ 2003ء میں آل مہاراشٹر اردو کانفرنس پونہ کی جانب سے اعزاز۔

☆ 2003ء میں فتح پور شیخاواٹی سے 'آفتاب شیخاواٹی' ایوارڈ۔

☆ 2004ء میں بہار ساہتیہ سنسد سمستی پور کی جانب سے 'مرے گیت اکیلے رہ گئے' پر میر تقی میر ایوارڈ۔

☆ ہندی اخبار 'بھارت ڈائری' پونہ کی جانب سے اعزاز۔

☆ 2005ء میں بزم اطفال مالیگاؤں کی جانب سے 'اعتراف خدمات'۔

☆ 2005ء میں بہار اردو اکادمی کی جانب سے 'مرے گیت اکیلے رہ گئے' پر انعام۔

☆ 2006ء مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکیڈمی کی جانب سے شعرائے پونہ ایک تحقیق پر انعام۔

☆ 2007ء میں مسلم ویلفیئر ایجوکیشن سوسائٹی پونہ کی جانب سے 'لائف ٹائم اچیومنٹ۔ علامہ اقبال ایوارڈ۔

☆ 2007ء یوپی اردو اکادمی کی جانب سے 'کالی داس گپتا رضا کے ادبی سفر' پر انعام۔

☆ 2007ء پہلا خوشتر کھنڈوی ایوارڈ، بزم خوشتر کھنڈوا کی طرف سے۔

☆ 2008ء کو انسٹا ٹینو پل آرتھوڈوکس انسٹی ٹیوٹ (امریکہ) ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری۔

☆ 2009ء علامہ شبلی ایوارڈ، حمد نعت اکیڈمی دہلی کی طرف سے۔

☆ بزم احسان ادب، فتح پوری شیخاواٹی کی جانب سے پہلا علامہ کالی داس گپتا رضا ایوارڈ۔ (21000 روپے اور مومنٹو)

☆ 2010ء یوپی اردو اکادمی کی جانب سے ''پونے میں اردو افسانہ'' ایک تحقیق پر انعام۔

خصوصی اشاعت :............

☆ سہ ماہی 'توازن' مالیگاؤں (گوشہ) ☆ روزنامہ 'مفسر' اورنگ آباد (گوشہ)

☆ سہ ماہی 'سفیر اردو' لیوٹن برطانیہ (گوشہ) ☆ سہ ماہی تکمیل۔ ممبئی (گوشہ)

☆ ہفتہ روز، سیرت ویکل ممبئی میں خصوصی اشاعت مرتب فرحان حنیف وارثی۔

☆ روزنامہ صحافت ممبئی میں خصوصی انٹرویو۔

☆ سہہ ماہی کاروان ادب۔ بھوپال (گوشہ)

ریسرچ: ....

☆ مقالہ برائے ایم فل بعنوان 'نذیر فتح پوری کی شاعری کا تنقیدی جائزہ' از محمد عارف بھائی۔

☆ نگراں ڈاکٹر روشن اختر کاظمی۔ راجستھان یونیورسٹی جے پور۔

☆ مقالہ برائے .Ph.D بعنوان 'نذیر فتح پوری۔ حیات اور خدماتِ ادب' از محمد ناصر اللہ انصاری۔

نگراں: ڈاکٹر حامد اشرف۔ سوامی وویکانند یونیورسٹی ناندیڑ، مہاراشٹر۔

درسی کتب: ....

☆ NDA پونہ کے نصاب اردو برائے فوج میں نظم۔

☆ راجستھان کے نصاب اردو برائے چہارم میں نظم 'ہم پر وطن کو ناز ہے' شامل ہے۔

☆ راجستھان کے نصاب اردو برائے درجہ ششم میں نظم 'نیا عہد نامہ' شامل ہے۔

☆ راجستھان کے نصاب اردو برائے دہم میں ایک نظم 'خاکِ وطن' شامل ہے۔

☆ ساہتیہ اکیڈمی دہلی کی کتاب 'اردو ادب میں بچوں کی اینتھولوجی' میں 'بچوں کی غزل' شامل ہے۔

(مرتب ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی)

ادارت: ....

☆ اکتیس سال سے سہ ماہی ادبی رسالہ 'اسباق' شائع کر رہے ہیں۔

کتابوں کی اشاعت: 'اسباق پبلی کیشنز' پونہ کے زیر اہتمام غیر تجارتی طور پر اردو کی 92 کتابیں شائع کر چکے ہیں۔

رابطہ:

Nazeer Fatehpuri,
'Saira Manzil' 230/B/102, Viman Darshan, Sanjay Park,
Lohgaon Road, **Pune** 411032, M.S. Mob:0091-9822516338

ڈاکٹر نذیرؔ فتح پوری کی تصانیف......

ناول

۱) چٹانوں کے بیچ 1975ء

۲) زخم اور آہیں 1977ء

شاعری

۳) بچو! آؤ گیت سنائیں۔ 1983ء

۴) لمحوں کا سفر (غزلیں)۔ 1985ء

۵) غزل اندر غزل (آزاد غزلیں) 1988ء

۶) سفر تا سفر (غزلیں)۔ 1991ء

۷) تیسرا سفر (غزلیں) 1993ء

۸) ریگِ رواں (ماہیے)۔ 1997ء

۹) اکرام (نعت)۔ 1998ء

۱۰) نیا دن پھوٹ کر نکلا (شاعری)۔ 2000ء

۱۱) مٹھی بھر ماہیے (ماہیے)۔ 2001ء

۱۲) یہ زمین میری ہے (ہندی)۔ 2003ء

۱۳) مرے گیت اکیلے رہ گئے۔ 2004ء

۱۴) سفر مدام سفر 2008ء

۱۵) ثنائے جلیل 2008ء

۱۶) مثنوی جواب زہر خند 2011ء

نثر

۱۷) لفظوں کے سائے تلے (مضامین) 1995ء

۱۸) جگن ناتھ آزاد۔ ایک مستقل ادارہ 1998ء

۱۹) اردو افسانے کی مقبول ترین آواز 1999ء

۲۰) جہان گیتا رضا۔ 1999ء

۲۱) غالبؔ، گیتا رضا اور سنجے گوڈ بولے 2000ء

۲۲) ریزہ ریزہ دل (منی افسانے) 2005ء

۲۳) ڈاکٹر ساحر شیوی کا تخلیقی منظر نامہ 2007ء

۲۴) ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کا تخلیقی منظر نامہ اردو 2008ء

۲۵) ڈاکٹر ودیا ساگر آنند تخلیقی منظر نامہ ہندی 2009ء

۲۶) ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور ژرف گوئی 2010ء

ترجمہ

۲۷) ڈھلی ڈھلی شام کا اجالا، ہندی ناول کا ترجمہ 2009ء

ترتیب وانتخاب

۲۸) کوثر صدیقی۔ فن اور شخصیت 2000ء

۲۹) دلدار ہاشمی۔ فن اور شخصیت 2001ء

۳۰) علامہ کالی داس گپتا رضا نمبر 2001ء

۳۱) حیدر قریشی۔ فن اور شخصیت 2002ء

۳۲) امین حزیں۔ شخص، شاعر اور استاد 2003ء

۳۳) مناظر عاشق ہرگانوی کا ادبی منظر نامہ 2004ء

۳۴) عصمت جاوید شیخ 2004ء

۳۵) فراز حامدی کے اردو گیت 2006ء

۳۶) علامہ کالی داس گپتا رضا کے ادبی سفر

۳۷) جلیل الہ آبادی شخصیت اور شاعری

۳۸) اصغر ویلوری کی غزلیہ شاعری

۳۹) نور اسعد اختر 2010ء

۴۰) ماں کے نام 2010ء

تاریخ وتذکرہ اور تحقیق

۴۱) تاریخ و تذکرۂ فتح پور شیخاوائی 2003ء

۴۲) شعرائے پونہ۔ ایک تحقیق۔ 2005ء

۴۳) پونے میں اردو افسانہ ایک تحقیق۔ 2010ء

۴۴) امیر تیمور (بچوں کے لیے ناول) 2010ء

۴۵) امیر تیمور ہندوستان میں (بچوں کے لیے ناول) 2011ء

۴۶) اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر 2011ء

سفرنامہ

۴۷) پونے سے رانچی کا سفر 2011ء

ڈاکٹر نذیرؔ فتح پوری کے غیر مطبوعہ مسودے

شاعری

۱) تتلیوں بھرا آسمان۔غزلیں

۲) پانچویں سمت۔غزلیں

۳) پہلے دکھ کا نزول۔نظمیں

۴) کرموں کا محصول۔دوہے

۵) دوسری کربلا۔نثری نظمیں

۶) ثنائے جمیل۔نعتیہ کلام

۷) ہنگامی شاعری۔نظمیں

۸) ابرِ رواں۔تیسرا مجموعہ،ماہیے

۹) ابتدائی غزلیں

۱۰) دیوان (مجموعہ غزلیات)

ترتیب وانتخاب

۱۱) کالی داس گپتا رضا کی یادداشتیں

۱۲) رضا بنامِ نذیرؔ۔مکتوبات

۱۳) آزاد بنام نذیرؔ۔مکتوبات

۱۴) اردو ماہیے کا ہندوستانی انتخاب

۱۵) شاعری میں برسات

۱۶) اردو شاعری چندر بھان برہمن سے، چندر بھان خیال تک (ہندی میں)

تحقیق وتنقید اور تذکرے

۱۷) غالب کا ایک گمنام شاگرد۔حکیم خداداد خان دہلوی

۱۸) پونہ۔مشاہیر اہلِ قلم کی نظر میں

۱۹) راجستھان میں اردو کا تخلیقی سفر

تخلیقی نثر

۲۰) جستجو کا کرب۔افسانے

۲۱) چلتے چلتے۔ناول

۲۲) کرن کا پیار۔ناول

ڈرامے

۲۳) شاہجہاں

۲۴) آخری جام

۲۵) زینت محل

۲۶) کل کا سورج

۲۷) میں فنکار ہوں

ادبی نثر

۲۸) ادبی مضامین۔۱

۲۹) ادبی مضامین۔۲

۳۰) تبصرے

طنزومزاح

۳۱) غالبؔ اور ہم۔مضامین

ڈاکٹر نذیرؔ فتح پوری کے
فکر و فن پر مرتب کردہ کتابیں اور گوشے

نام کتاب	مرتب
۱) احتسابِ نذیرؔ	رشید اعجاز، اظہار مسرت
۲) نذیرؔ ۔ شخصیت اور فن	ڈاکٹر رفعت اختر
۳) نذیرؔ فتح پوری ۔ تعارف	دلدار ہاشمی
۴) نذیرؔ فتح پوری ایک دوست ایک شاعر	عادل فتح پوری
۵) نذیرؔ فتح پوری ایک تعارف	دستگیر ضیاء فتح پوری
۶) نذیرؔ فتح پوری ۔ شخص شاعر اور مدیر	رفیق جعفر
۷) نذیرؔ فتح پوری ۔ خواتین اہلِ قلم کی نظر میں	ڈاکٹر قمر جہاں، ڈاکٹر حسن آرا کوٹہ
۸) نذیرؔ فتح پوری کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	عارف بھائی (برائے ایم فل)
۹) نذیرؔ فتح پوری کی ادبی فتوحات	ڈاکٹر سیفی سرونجی
۱۰) نذیرؔ فتح پوری ۔ نئے گیتوں کا ساحر	ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
۱۱) سہ ماہی توازن مالیگاؤں، گوشہ	مدیر: عتیق احمد عتیق
۱۲) سہ ماہی تکمیل ممبئی، گوشہ	مدیر: مظہر سلیم
۱۳) روزنامہ مفسر اورنگ آباد، دو خصوصی گوشے	مدیر: عارف خورشید
۱۴) سہ ماہی 'سفیر اردو' لندن، گوشہ	مدیر: سید معراج جامی
۱۵) نذیرؔ فتح پوری ۔ حیات اور خدمات ادب	محمد ناصر اللہ انصاری برائے Ph.D (گائیڈ: ڈاکٹر حامد اشرف، S.R.T.M. یونیورسٹی، ناندیڑ)
۱۶) نذیرؔ فتح پوری شاخ در شاخ	پروفیسر اقبال گل اسلام آباد پاکستان

۱۷) Ph.D. نذیرؔ فتح پوری شخصیت اور ادبی کارنامے

ریسرچ اسکالر: ترنم، گائیڈ: ڈاکٹر حسن آرا۔ یونیورسٹی آف کوٹہ، کوٹہ راجستھان

Dr. Nazir Fatehepuri Pune ke Adbi Ufaque Ka Suraj

By : Dr. Nasreen Ramzan Sayyed

تعارف

نام : ڈاکٹر نسرین رمضان سیّد

تعلیم : ایم اے۔ پی ایچ ڈی

پیشہ : معلمی

تصانیف : ☆ ایک کہانی ایک نصیحت ۲۰۰۹ء (بچوں کے لیے کہانیاں)

☆ زندگی ایک افسانہ ۲۰۱۰ء

(افسانوں کا مجموعہ، مہاراشٹر راجیہ اُردو ساہتیہ اکادمی، سے انعام یافتہ)

☆ چراغ کا جن اور زید ۲۰۱۱ء (بچوں کے لیے کہانیاں)

☆ بھیگی پلکیں مسکراتے ہونٹ ۲۰۱۱ء (افسانوں کا مجموعہ، بہار اُردو اکادمی سے انعام یافتہ)

☆ خواہشوں کے بھنور ۲۰۱۳ء (افسانوں کا مجموعہ

(۲۰۱۳ء کے لیے اُتر پردیش اُردو اکیڈمی سے انعام یافتہ)

☆ تحفہ ۲۰۱۴ء (بچوں کے لیے کہانیاں)

☆ لکیر کا فقیر ۲۰۱۴ء (بچوں کے لیے کہانیاں) این سی پی یو ایل کی جانب سے شائع

☆ دل کی گلی میں چاند اُترا ۲۰۱۴ء (ناول)

☆ شاعرہ۔ ساوتری بائی پھلے ۲۰۱۵ء

☆ مہاتما جیوتی راؤ پھلے (نظریات اور ان کا ادب) ۲۰۱۵ء

زیر اشاعت : ☆ خواتین ناول نگار ☆ دھنک سے خواب (ناول) ☆ ڈراموں کا مجموعہ

☆ سُلطانہ چاند بی بی ☆ ڈاکٹر راجندر پرساد ☆ شہید ٹیپو سُلطان

☆ سوامی وویکانند (بچوں کے لیے) ☆ افسانوں کا مجموعہ (ہندی میں)

خط و کتابت کا پتہ:

ڈاکٹر نسرین رمضان سیّد ۹۹۲۱۴۸۱۲۴۱

زید کاسل، سنکیت پارک، محمد واڑی روڈ، محمد واڑی، ہڈپسر، پونے، مہاراشٹر 60

Email : nasreensayyed1967@gmail.com